تالیفاتِ صبیح رحمانی: نقدِ نعتؐ کی نئی تشکیل

ڈاکٹر طاہرہ انعام

ڈاکٹر طاہرہ انعام نے اس تصنیف کے توسط سے کئی اہم خدمات انجام دی ہیں کہ ان کی دلچسپی اور کوشش سے ایک تو کئی نعت گو شاعر صبیح رحمانی کے توسط سے ہمارے مطالعے میں آ رہے ہیں کہ جن سے خود نعت نگاری کے جدید اور نمائندہ رجحانات اور اسالیب اب یکجا ہمارے سامنے موجود ہیں اور دوسرے ان نعت نگار شاعروں کے تجزیاتی مطالعات کے ذریعے ہم اردو نعت نگاری کی عصری صورتِ حال اور ارتقا سے بھی واقف ہو رہے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

مصنفہ کا تعارف:

طاہرہ انعام (پی ایچ ڈی)

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج برائے خواتین غلام محمد آباد فیصل آباد

tahira.inaam@gmail.com

مطبوعات:

تراشیدم (شعری مجموعہ)

پرستیدم (شعری مجموعہ)

زیرِ طباعت:

شکستم (شعری مجموعہ)

تحقیقی کاوشیں:

فیصل آباد میں اردو افسانہ

پاکستانی اردو غزل کا اسلوبیاتی مطالعہ

اُردو شاعری میں واقعۂ معراج (فکری و تجزیاتی مطالعہ)

تالیفاتِ صبیح رحمانی: نقدِ نعت کی نئی تشکیل

ڈاکٹر طاہرہ انعام

اشاعت	:	2021ء
نام کتاب	:	تالیفاتِ صبیح رحمانی: نقدِ نعت کی نئی تشکیل
مصنفہ	:	طاہرہ انعام
مطبع	:	مہر گرافکس اینڈ پبلشرز
ناشر	:	راشد حسین
کمپوزنگ	:	ماجد حسین
تعداد	:	500
قیمت:	:	400

Talifat-e-Sabeeh Rahmani: naqd-e-Naat ki Nayi Tashkil

By

Dr. Tahira Inaam

اہتمامِ اشاعت

مہر گرافکس اینڈ پبلشرز

احسان سنٹر، فرسٹ فلور، گلی نمبر 7 منشی محلّہ بھوانہ بازار فیصل آباد

0306-5267717, 0313-6167717

rashidh30@gmail.com

بصد احترام

ابّو اور امّی کے نام

فہرست

پیش گفتار

صبیح رحمانی نے عمرِ عزیز کو اُس وقت سے نسخہ ہائے نعت کی تالیف کے لیے وقف کر رکھا ہے جب مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا۔ اکتسابِ شعور کا عمل یکبار گی مکمل نہیں ہوتا۔ خارجی دنیا سے انسلاک اور موافقت کا شعور تو بدنی ارتقاء سے مشروط ہو سکتا ہے لیکن یہ شعور کہ انسان اپنے اندر کی آواز کو سننے، سمجھنے اور اس کے موافق سفر کرنے کے لائق ہو جائے۔۔۔ یہ خوش کن واردات عمر کے کسی بھی حصے میں ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تادمِ آخر کوئی نتیجہ خیز راہ ان کی نظروں پر اُجاگر نہیں ہوتی۔۔۔ بعضے خوش قسمت ایسے بھی ہیں کہ شعور کی اس متانت کو جلد پا جاتے ہیں اور قدرت انھیں وقیع مناصب کے شایان کر دیتی ہے۔

دورِ حاضر میں صنفِ نعت کی بار آوری کے لیے صبیح رحمانی کی مساعی ایک جذبۂ صادق سے تحریک پاتی رہی ہیں۔ یہ رجحان ساز اقدامات ان کے بعض شخصی خصائص کے مرہونِ منت ہیں۔ رنج و محن سے بے اعتنائی کسی شخص کو فعال اور متحرک رکھتی ہے۔ ابتداً دو چار سخت مقامات خندہ پیشانی سے طے کر لیے جائیں تو آگے کا راستا بہر صورت ہموار ہی محسوس ہوتا ہے ان کی نعتیہ تالیفات کا غالب محرّک یہ ہے کہ نعتیہ موضوعات کو پھیلانے اور مرغوب بنانے کے لیے بنیادی مواد تیز ترین ذرائع سے میسّر ہو۔ حوالے کی ایسی کتب سامنے آئیں جو تحقیقی و تنقیدی

ضروریات کو پورا کر سکیں تا کہ منتشر سرمائے سے آہستہ رَواستفادہ جویندگانِ نعت کو کم حوصلہ نہ کر سکے۔ یہ مضامین الگ الگ مواقع پر الگ محرکات کے تحت زیبِ قرطاس ہوئے لیکن یہ مضامین اپنے اندر جو منطقی ربط و تسلسل رکھتے ہیں اور مافی الضمیر کی تفہیم و ترسیل کے حوالے سے جس تاثر کے حامل ہیں اس سے واضح ہے کہ مرتّب نے اپنے مقصد سے شدید وابستگی کے تحت کسی انتخاب کو ہنگامی اقدام نہیں بننے دیا بلکہ اس کا ذہن بہت سے اذہان کے ساتھ شب و روز ایک عالمِ شوق میں سفر کر تا رہا ہے۔

زیرِ نظر تالیفات میں جس تنقیدی شعور کے ساتھ حمد و نعت کے مختلف موضوعات منور ہو کر سامنے آئے ہیں اس سے بالیقین یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ نقدِ نعت کی نئی تشکیل عمل میں آ رہی ہے۔ ایک ایسا منظر نامہ فروغ پا رہا ہے جو واضح خدوخال رکھتا ہے۔ تالیف نگاری کم تر ذمہ داری نہیں، یہ متنوع اذہان اور متنوع مقاصد تحریر کو جُویانِ علم کے روبرو توازن اور یکجائی دینا ہے۔ صبیح رحمانی نے قوائے قلبی کو نعتیہ ادب سے اس طرح مربوط کر رکھا ہے کہ کوئی اور خیال ان کا دامن گیر نہیں ہوتا۔ اسی ہمہ دم، کثیر پہلو ریاضت کا ثمر ہے کہ (قلیل مدت کے بعد ہی) نعتیہ ادب کی داستان میں ''نعت رنگ'' کی حیثیت ایک بانکے، سجیلے، چونکا دینے والے کردار کی نہیں بلکہ ایک راہبر، دستگیر، بشارت نواز بزرگ کی ہے۔۔۔ طبیعت، جذبے اور مقصد کا یہ رنگ ان کی تالیفات سے بھی منعکس ہے۔ اُردو نعت کی شعری روایت کے تاریخ وارتقا، رجحانات اور تقاضوں کو سمجھنا، سمیٹنا اور خواہش منداذہان تک ان کا ابلاغ کر دینا نہایت مستحسن اقدام ہے جس سے صنفِ نعت کے تخلیقی و تنقیدی، ہر دو معیارات کی نہ صرف شہادت میسر آئی ہے بلکہ آئندہ امکانات کے فروغ کو اعتماد حاصل ہوا ہے۔ اس ضمن میں پیش کردہ سرمایہ نعتیہ فکر و فن کو جِلا بخشے گا۔ نئے راستوں کے نشان اُبھر سکیں گے۔ ان کی توجہ محض کلاسیکی روایت تک محدود نہیں رہی بلکہ صبیح رحمانی نے پاکستان کی اہم علاقائی زبانوں میں نعت کے حوالے سے تحقیق و تنقید پر مبنی تحاریر کو یکجا کیا ہے۔ اس

مجموعۂ افکار سے تمام زبانوں کے بولنے والے مسلمانوں کے تہذیبی و روحانی اشتراک کو دریافت کرنا، قرآن و سنّت اور عشقِ رسول ﷺ کو بنیادی حوالے اور فکری اساس کے طور پر مختلف اللسان شعری سرمائے میں جاگزیں دیکھنا۔۔۔ اسی ہمہ دم، کثیر پہلو ریاضت کا ثمر ہے۔ جس کا پہلے ذکر کیا گیا اُردو نعت میں سیرتِ مطہرہ کی تجلیات کیا تبلیغی کردار ادا کر سکتی ہیں۔۔۔ انوارِ سیرت کا نعت میں اظہار کس طرح انفرادی اور اجتماعی شور کو ضیابار کر سکتا ہے۔ اس موضوع پر غور و فکر کرنا یقیناً صنفِ نعت کی وقعت کو بڑھاتا ہے اور اسوۂ حسنہ کی تبلیغ کی فریضے کو ادبی نعت کا جمالیاتی آہنگ عطا کرتا ہے۔ غالبؔ جیسے عظیم شاعر کے حوالے سے نعت گوئی پر بحث و تمحیص نے گفتگو کے نئے در وا کیے ہیں اور خصوصاً اس رجحان کو فروغ دیا ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اپنے فکری، تہذیبی، ثقافتی اثاثے کو ہر عہد کی نابغۂ روزگار ہستیوں کے توسط سے جان سکتا ہے اور اس آگہی افزا عمل میں دیگر تمام علوم و فنون کی طرح صنفِ نعت گوئی بھی ایک کلیدی ذریعہ قرار پاتی ہے۔

اقبال شناسی کے ضمن میں کلامِ اقبال میں عشقِ رسول ﷺ کے عنصر کو صبیح رحمانی نے 'اقبال کی نعت' کہنے کا اعتماد بخشا ہے۔ اقبال کے اس کلام کو محض "غیر رسمی انداز" کا تمغہ پہنا کر تنقید کا فرض ادا نہیں ہوتا۔ تنقید کا ایک مقصد ادب کو اعلیٰ معیارات عطا کرنا ہے، اقبال کے اس اندازِ جداگانہ کو دنیائے نعت کی رسم بنا دینا اقتضائے نعت ہے۔ اقبال کا کلام یکتا مثال ہے لیکن اسے تنہا مثال نہ ہونا چاہیے۔ افکارِ اقبال کو بالخصوص اقبال کی نعت نگاری کی شناخت کے ساتھ پیش نہ کیا جاتا تو اس رجحان ساز کاوش کے بغیر فکرِ اقبال کے یہ موتی محض عجائب گھر میں رکھے نوادرات کی مثل بے اثر رہ جاتے۔ میدانِ نعت میں اقبال کی اس اجتہادی شان کو نمایاں کرنے کا یہ کارِ نظیف بھی صبیح رحمانی کے حصے میں آیا ہے۔ نیز محسن کاکوروی کا فن اپنی تمام تر ندرت و لطافت اور جمالیات کے باوجود میدانِ نقد و نظر میں کماحقہٗ، درخورِ اعتنا کیوں نہ ہو سکا۔ اس سوال کی کھوج نے انھیں کلامِ محسن کی ادبی فکری جہات پر سرمایہ جمع کرنے کی ترغیب دی اور انھوں نے کلامِ محسن کے مطالعے کے لیے بیشتر فکری،

اسلوبیاتی، لسانیاتی اور سماجی و عمرانی زاویے یکجائی سے اجاگر کر دیے یہی صورتحال کلامِ رضا کی ہے۔ صبیح رحمانی نے اس مذہبی و مسلکی رہنما کی شاعرانہ حیثیت کی طرف قاری و ناقد کو متوجہ کرنے کی جو مثبت کاوش کی ہے یہ نعتیہ تنقید کو دور رس ثمرات عطا کرے گی۔ جو دیگر اہم شعرا کو جدید حقائق کی روشنی میں از سرِ نو دریافت کرنے میں معاون ہوں گے۔ اسلامی ادب کی تفہیم اور پرکھ رکھنے والے صاحب رائے نقاد اور شاعر کشفی صاحب پر جمع کیے گئے مقالات اس ضروری امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ میدانِ نعت میں ناپختہ اذہان کی بڑھتی ہوئی تعداد کے روبرو ان مجاہدینِ ادب کی مثال رکھی جائے جنھوں نے ظلمت پرستی کے دور میں بھی بقول صبیح رحمانی ”دینی محکمات اور شعائر کے حوالے سے اپنی ادبی تخلیقات کو جمیل بنایا۔“

صبیح رحمانی کی ادارتی تحریروں کی طرح ان تالیفات کے دیباچوں میں ان کے ذاتی اندازِ نقد و نظر کی جو جھلکیاں موجود ہیں، ان سے مترشح ہے کہ ان کے قلم میں احساسِ ذمہ داری کی پیدا کردہ تمام تر معروضیت کے باوجود ان کی رائے دل سے نکلتی ہے۔ اس کا باعث ان موضوعات یا شخصیات سے (بحوالۂ نعت) ان کی والہانہ شیفتگی ہے جس طرح معیاری نعت میں حقیقت اور عقیدت جدا نہیں ہو سکتی اسی طرح وہ تنقید کو ان عناصر سے خالی نہیں ہونے دیتے۔ یہ راز انھیں خود بھی معلوم نہیں کہ خود کو نعتیہ ادب کا طالب علم اور قاری کہہ کر یہ بظاہر تاثراتی گفتگو کرتے ہوئے وہ حقیقت میں جدید نقدِ نعت کے موجد ہو گئے ہیں۔ خصائصِ نعت سے ان کے مزاج کی یہ تطبیق آئندہ بھی رنگ لاتی رہے گی۔

زیرِ نظر کتاب سے کوئی ادعا مقصود نہیں یہ محض سفر شوق کا ایک جائزہ ہے۔ جس کے قاری سے عزیمتِ عمل کا قائل ہونے کی توقع کی گئی ہے۔

ڈاکٹر سیّد معین الدین عقیل، ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط، ڈاکٹر ریاض مجید اور ڈاکٹر عزیز احسن جیسی فاضل شخصیات نے اس کتاب پر توجہ فرمائی میں ان اکابرین کی بے حد شکر گزار ہوں۔ اللہ کریم ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر طاہرہ انعام

تاثرات

’’تالیفاتِ صبیح رحمانی: نقدِ نعت کی نئی تشکیل‘‘ پیشِ نظر ہے اور اس وجہ سے میرے لیے یہ پُرکشش ہے کہ ایک تو ’نعت ہائے قدسی‘ کے تعلق سے منتخب و نمائندہ مطالعات و تجزیوں پر مشتمل ہے، اور یہ ایسے مطالعات پر مرکوز ہے جو عزیز گرامی سیّد صبیح الدین رحمانی کی کاوشوں کے تاثرات پر مشتمل ہیں۔

’نعت‘ کے بارے میں تو کیا کہنا کہ یہ ہمارے عقیدے کا ایک جزو ہے، لیکن عزیزم صبیح رحمانی کا نام آج اردو کی ادبی و روحانی دنیا میں صنفِ نعت کے ساتھ اس طرح لازم و ملزوم سا ہو گیا ہے کہ جہاں ایک نام سننے پڑھنے میں آیا وہیں دوسرا نام بھی ساتھ ہی چلا آتا ہے کہ آخر 'نعت رنگ' صرف نعت ہی کے لیے مخصوص سہی لیکن ایک عام سا رسالہ بھی نہیں، اسے تو اردو کی صنفِ نعت کے لیے عہد ساز کہنا چاہیے، جس نے نہ صرف اس صنف کی مقبولیت و پھیلاؤ میں اپنی صوری و معنوی دل کشیوں کے ساتھ بے مثال خدمات انجام دی ہیں بل کہ ہم ذوق تخلیق کاروں اور لکھنے والوں کو باہم مربوط کر کے ایک مثالی اور منفرد و موئثر خدمت بھی انجام دی ہے کہ جس کے طفیل 'نعت رنگ' اپنی مثال آپ بن گیا ہے۔ اس کے لیے یا اس کے توسط سے یہ منفرد خدمت صبیح رحمانی نے انجام دی ہے، جو اردو نعت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

'نعت رنگ' کے ساتھ ساتھ یا اس سے فزوں تر ان کی وہ کاوشیں بھی ہیں جو وہ اپنی دل چسپیوں کے ذیل میں 'نعت رنگ' کے اجرا و فروغ کے علاوہ اپنی تصنیفات و تالیفات کے ذریعے انجام دے رہے ہیں اور 'نعت ریسرچ سینٹر' کے تحت مفید و کارآمد مطبوعات کا ایک قیمتی انبار بھی لگا رہے ہیں، جو فروغِ نعت کے ضمن میں آج ایک مثال ہے۔

ایک کشش و انفرادیت اس کتاب میں یہ بھی ہے کہ اسے عزیزہ طاہرہ انعام نے تصنیف کیا ہے جن سے میں ابھی حال میں ان کے شعری مجموعوں: 'تراشیدم' اور 'پرستیدم' کے توسط سے متعارف ہوا ہوں۔ جب کہ ضمنی طور پر مجھے موصوفہ کے مطالعہ/تحقیق بموضوع: 'اُردو شاعری میں واقعہ معراج'' برائے پی ایچ ڈی سے بھی واقفیت ہوئی ہے جو ایک مستقل اور مفصل مطالعہ معراج نامہ کی صنف کا ہے جس پر اب تک محض سرسری و اشاراتی حوالے ہی تحقیق و تاریخِ ادب میں ہمارے متنوع مطالعات کا ایک ضمنی موضوع بنے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر دکنی معراج ناموں تک مخصوص ہیں، لیکن عزیزہ طاہرہ انعام نے اس موضوع پر ایک مستقل تحقیقی ارتقا کا مطالعہ کر کے اپنے موضوع و مقصد سے واقعتاً ادبی دنیا کو چونکایا ہے کہ اردو میں جہاں عقیدت و موانست کے ذیل میں زیادہ تر حمد و نعت ہی مطالعات کا موضوع بنتے رہے ہیں، معراج نامے بھی ہمارے مطالعات کے لیے ایک کشادہ موضوع بننے کا حق رکھتے ہیں جنھیں طاہرہ انعام نے کماحقہٗ توجہ و اہمیت دے کر ان کے ارتقائی و فنی مطالعے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان سب سے قطع نظر، ایک تسلسل سے اپنے انداز کے منفرد عنوانات کے ساتھ طاہرہ انعام کے مذکورہ شعری مجموعوں کی آمد اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے علاوہ شعری نزاکتوں اور احساسات کی پختگی اور پھر زبان و بیان یا اسلوب، ہر ایک میرے لیے آج کی جدید تر شاعری میں ایک ایسی مثال دکھائی دے رہی ہے، جو مجھے شاذ ہی کسی ابھرتے شاعر میں اس طرح جلوہ افروز نظر آتی ہے، لیکن اب ان شعری مجموعوں اور ان کے مقالہ/تحقیق

برائے حصولِ سند پی ایچ ڈی کے علاوہ ان کی زیر نظر تصنیف نعت نگاری کے ان مطالعات کے حوالے سے، جو صبیح رحمانی صاحب کی کاوشوں کو ہمارے سامنے لاتی ہے، ایک اضافی کاوش ہے جس کے توسط سے جہاں ہم ایک جانب صبیح رحمانی صاحب کی کوششوں سے واقف ہوسکتے ہیں وہیں ان کی ان کوششوں کے طفیل ان نعت نگاروں اور ان کی نعت نگاری سے بھی ہم ایک بڑی حد تک واقف ہوسکتے ہیں جن میں سے متعدد نام شاید ہم میں سے اکثر کے لیے اجنبی اور نئے بھی ہوں گے۔ چناں چہ اس طرح طاہرہ انعام صاحبہ نے اس تصنیف کے توسط سے بھی کئی اہم خدمات انجام دی ہیں کہ ان کی دل چسپی و کوشش سے ایک تو کئی نعت گو شاعر، صبیح رحمانی صاحب کے توسط سے، ہمارے مطالعے میں آرہے ہیں کہ جن سے خود نعت نگاری کے جدید اور نمائندہ رجحانات اور اسالیب اب یک جا ہمارے سامنے موجود ہیں اور دوسرے ان نعت نگار شاعروں کے تجزیاتی مطالعات کے ذریعے ہم اردو نعت نگاری کی عصری صورتِ حال اور ارتقا سے بھی واقف ہورہے ہیں۔

اس زیر نظر تصنیف کا یہ بھی ایک بڑا وصف ہے کہ یہ ہمیں جدید نعت نگار شاعروں کی خدماتِ نعت اور ان کے فنی محاسن سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ صبیح رحمانی صاحب کی اس ضمن میں کاوشوں کے وصف و امتیاز سے بھی واقف کرارہی ہے جس کے طفیل اپنے موضوع اور اپنے مطالب کے لحاظ سے واقعتاً یہ تصنیف مستقبل کے مطالعات میں آج کے دور کی نعت نگاری اور اس کے فن و معیار کو متعین کرنے کے لیے ایک اہم ماخذ قرار پائے گی۔ اس مناسبت سے اس تصنیف کے منصوبے اور اس کی تکمیل کے لیے ایک بہت مناسب اسلوب میں اس کا اہتمام بہت خوش آئند ہے جس پر فاضل مصنفہ قابلِ مبارک باد و تحسین ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

''تالیفاتِ صبیح رحمانی'' تنقیدی جائزہ

تصنیف، ترتیب، تالیف، تسوید ایسے مصادر ہیں جن کا بالراست تعلق کتاب سازی اور کتاب شناسی کے عمل سے ہے۔ ان میں ترتیب و تالیف دونوں فن تصنیف و تسوید سے قدرے ارزاں اور سہل سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کسی مرتبہ یا مولفہ ادب پارے کا تعلق ہے تو اس کی تدوین کے عمل میں مولف دہرا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ایک تو اسکی پرکھ کے لیے اور دوسرے اس کی پسند کے لیے۔ لہٰذا مدوّنہ یا مولّفہ کتاب مولف کی دونوں خوبیوں خامیوں کی شہادت دیتی ہے۔ یہ ایسی کسوٹی ہوتی ہے جس پر اس کی ادبی ذہنی سطح اور دوسروں کی ادبی تخلیقات کو سمجھنے کی صلاحیت، متن میں نہاں تصوراتی اور معنوی حسن کی استحسانی وضاحت کی فراست و قابلیت کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس معنی میں تالیف، تصنیف کے مقابلے میں ایک پیچیدہ عمل ہوتا ہے، اس لیے کہ تصنیف کا دارومدار مصنف کے اپنے صواب دید پر ہوتا ہے، اس کے برعکس تالیف کے دائرے میں مولف خود مصنف کی ذمہ داریوں کو بھی اپنے اوپر لازم کرلیتا ہے۔

''تالیف'' کسی ایک موضوع پر مختلف تخلیق کاروں کی تخلیقات کو باہم سمیٹ کر انھیں کتابی شکل دینے کا عمل ہے۔ اس میں موضوع کی مناسبت سے آراء میں اختلاف کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ مولف اس قسم کی صدرنگی میں یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا

ہے اور مضامین کو ایسا مرتب کرتا ہے کہ ان کے تنوع میں ارتکاز کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم بطور روز مرہ اسے کثرت میں وحدت کی جلوہ گری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات مختلف مصنّفین کے الگ الگ عنوانات پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت دی جاتی ہے۔ تالیف کی یہ بھی ایک شکل ہے۔ لیکن تالیف کی پہلی قسم زیادہ مشکل کام ہے۔

سیّد صبیح رحمانی نے فن نعت گوئی کے نئے نئے آفاق تلاشے ہیں اور عقیدۂ حب رسول کی ضیاء باری سے انھیں منور کر دیا ہے۔ جس طرح شاعری میں نعت ہی کو انھوں نے حرز جان اور تعویذ ایمان بنایا اسی طرح اپنی نثری تخلیقات میں بھی اس نعت نگر کے باسی اور جادۂ رحمت کے مسافر نے نعتیہ مضامین ہی کو توشۂ آخرت بنا لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو اخروی سرخ روئی کے لیے قبول فرمالے۔ آمین۔ صبیح رحمانی اپنی تخلیقات میں عشقِ رسولؐ میں سرشار ضرور نظر آتے ہیں مگر عقیدت میں غلو کا نشّہ انھیں صراط مستقیم سے نہیں بھٹکاتا۔ اپنی نثری تالیفات میں انھوں نے موضوعاتِ نعت میں تنقید کو بھی روا رکھا اور کبھی ناک بھوں نہیں چڑھائی۔ 'نعت رنگ' جیسا موقر تقدیسی صحافت کا حامل جریدہ اس کی بین مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں ہر مکتبِ فکر اور مسلک کی تحریریں بلا کم و کاست و بلا تعب و تعصب جگہ پاتی رہی ہیں۔

حب رسول ﷺ کے اظہار کے بکھرے موتی سمیٹنے کے لیے بھی صبیح رحمانی سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے تالیف کے فن کو اختیار کیا اور الحمد للہ اس ضمن میں ان کی دس گیارہ تالیفات منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں اردو نعت کی شعری روایت، پاکستانی زبانوں میں نعت، غالبؔ اور ثنائے خواجہ، کلامِ محسن کاکوروی: ادبی و فکری جہات، کلام رضا: فکری و فنی زاویے، اقبال کی نعت: فکری و اسلوبیاتی مطالعہ، نعت نگر کا باسی: ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعاتِ حمد و نعت، اردو نعت میں تجلیات سیرت، اردو حمد کی شعری روایت وغیرہ نہایت اہم کتابیں ہیں۔ ان میں صبیح نے نہایت الفت کے

ساتھ مختلف ادباء کے مضامین یکجا کر لیے ہیں اور اپنے تالیف قلب کا ثبوت بہم پہنچایا۔ مذکورہ تالیفات کی مشمولات بر صغیر کے تقدیسی ادب سے دلچسپی رکھنے والے نامور ادباء کے مضامین ہیں جو یا تو صبیح رحمانی نے خلوص و محبت کا پیغام دے کر لکھوائے ہیں یا مختلف کتابوں اور رسالوں سے تلاش کر کے انھیں جمع کیا ہے۔ ان کی اس محنت اور لگن کی وجہ سے حمد و نعت کے مختلف موضوعات یکجا ہو گئے ہیں۔ مبتدیوں اور اسکالروں کو ان سے بہت ساری آسانیاں حاصل ہوں گی۔

صبیح رحمانی کی ان تالیفات کا فنی اور تنقیدی جائزہ طاہرہ انعام نے اپنی کتاب ''تالیفاتِ صبیح رحمانی'' میں لیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ مصنفہ نے ان تالیفات کے کم و بیش دو ڈھائی ہزار صفحات کا بالا ستیعاب مطالعہ کیا ہو گا۔ اس لیے کہ ہر کتاب کی مشمولات کا اس تصنیف میں باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنفہ فیصل آباد کے سرکاری کالج میں پڑھاتی ہیں اور انھوں نے دورانِ ملازمت اپنے ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کے مقالات یونیورسٹی میں داخل بھی کر دیے ہیں۔ اس سے ان کی سخت کوشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعرہ بھی ہیں۔ تا حال ان کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں غزل سے انھیں دلچسپی ہے اور ان کا تمام کلام تغزل آشنا ہے۔ ان کے مجموعوں کے ناموں میں بھی بھرپور شعریت پائی جاتی ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے کا نام اقبالؔ کی رباعی سے مستعار ''تراشیدم'' اور دوسرے مجموعے کا نام ''پرستیدم'' ہے۔ طاہرہ انعام شاعری کے علاوہ تحقیق سے بھی دل چسپی رکھتی ہیں۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد کے شعبۂ اردو کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر زمرد کوثر کی نگرانی میں '' اردو شاعری میں واقعۂ معراج'' پر پی ایچ۔ڈی کا مقالہ تیار کیا ہے۔ جس کے عنوان اور مقالے کے ضمنی موضوعات پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ موصوفہ کا تحقیقی شعور بالیدہ ہے اور فن تنقید میں بھی درک رکھتی ہیں۔

اس وقت میرے پیشِ نظر ''تالیفاتِ صبیح رحمانی'' ہے۔ اس کتاب میں طاہرہ انعام نے صبیح رحمانی کی تالیفات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ پیش گفتار میں انھوں نے ان تالیفات کے تجزیے میں اپنے تنقیدی شعور کی رو کو کس طرح روبعمل لایا گیا اسے اجمالاً بیان کر دیا ہے۔ مصنفہ نے صبیح رحمانی کے 'نعت رنگ' کے اداریوں اور زیر نظر تالیفات کے دیباچوں کی روشنی میں مولف کے تنقیدی شعور کو آنکنے کی کوشش کی ہے اور انہی ماخذات کو ان کی تنقید کی اساس مان کر صبیح رحمانی کی تالیفات کا جائزہ لیا ہے۔ مصنفہ نے اس بات کا برملا اعتراف کیا ہے کہ، 'دور حاضر میں صنفِ نعت کی بارآوری کے لیے صبیح رحمانی کی مساعی جس جذبۂ صادق سے تحریک پاتی رہی ہیں یہ رجحان ساز اقدام ان کے بعض شخصی خصائص کے مرہونِ منت ہیں۔' (پیش گفتار ص۶) اسی پیش گفتار میں موصوفہ نے اپنے تنقیدی جائزے کی تلخیص دو دو تین تین جملوں میں پیش کر دی ہے۔ اس پیش گفتار میں ''تالیف نگاری'' کی ترکیب محل نظر ہے، مجھے سہو قلم محسوس ہو رہا ہے کیونکہ جس طرح '' تصنیف نگاری'' غلط قواعدِ زبان ہے اسی طرح تالیف نگاری بھی غلط ترکیب ہے۔ بہر حال! یہ کتاب تالیفات پر تنقید کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کتاب میں طاہرہ نے صبیح کی کم و بیش ایک درجن تالیفات میں شامل ڈیڑھ سو سے زائد مضامین پر تنقید و تنقیدِ نعت کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑی دل جمعی اور اعتماد کے ساتھ بحث کی ہے اور جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں انھیں بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون صبیح رحمانی کی مولفہ کتاب '' اردو نعت کی شعری روایت'' کے تنقیدی جائزے پر ہے۔ مولف نے اس موضوع کو چار حصوں میں بانٹا ہے۔ تعریف، تاریخ، رجحانات اور تقاضے۔ ان چاروں موضوعات کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنفہ فرماتی ہیں:

'' حصہ اول کے مضامین مستند حوالوں سے نعت کی تعریف مہیا کرتے ہیں۔ مضامینِ نعت کے ماخذات پر ایمان افروزانداز میں روشنی ڈالی گئی ہے ۔۔۔۔ اردو میں نعتیہ سرمائے کی موضوعاتی تقسیم کی گئی ہے۔ مثلاً مولود

نامے، معراج نامے ،وفات نامے ، اسرائیلیات اور صنمیات کے تحت ان نعتیہ اصناف کی تعریف، شعری محاسن اور تہذیب و تاریخ کے تناظر میں ان کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔۔ان مضامین میں اسلوب نعت کے تقاضوں کو مذہبی استناد مہیا کیا گیا ہے ۔۔۔ اردو نعت گوئی کے تاریخی اور ارتقائی جائزے میں بعض تحریروں کی حیثیت محض ایک فہرست کی سی ہے لیکن بعض تحریریں نعت گوئی کی روایت کا منظم اور باحوالہ تحقیقی جائزہ پیش کرتی ہیں۔ جس میں اشعار کی عمدہ مثالیں ذوق تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہیں۔ یہ تاریخی جائزہ اسالیبِ نعت پر اور اور مختلف ادوار میں مستعمل اصناف سخن پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔۔۔ اردو نعت گوئی کے رجحانات کا احاطہ کرنے کے لیے تالیفی سرگرمی، تصنیف سے بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ متنوع تحاریر، متفرق رجحانات کو بہتر انداز میں اجاگر کر سکتی ہیں۔"

نعت کے تقاضے کے تحت طاہرہ انعام اس امر پر زور دیتی ہیں کہ نعتیہ تنقید میں جہاں عقیدت اور ادبیت کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں اس کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ مصنفہ نے اس کتاب میں مولف صبیح رحمانی کی تنقیدی نظر اور مضمون / مقالہ نگاروں کی انتقادی فکر دونوں کا فنی تجزیہ کیا ہے۔اس کے لیے انھوں نے جگہ جگہ مقالہ نگاروں کے حوالے بھی دیے ہیں۔اپنے مضمون کے آخر میں مصنفہ نے نقد نعت کے لیے اپنی حتمی رائے بھی دی ہے کہ:

"مجموعی ادبی معیار کو سامنے رکھ کر متوازن رائے قائم کرنے کا شعور لازم ہے جو نعت گوئی کی حوصلہ شکنی کا باعث نہ ہو۔ نعت کے ادبی حسن کے لیے وہ سبھی پیمانے لیے جائیں جو دیگر اصناف کے لیے ہیں۔یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ نعت کو ایک وقیع صنف سخن کا اعتبار حاصل ہے۔نعت پر کڑی تنقید

ضروری ہے بشرطیکہ سیاق و سباق کو محدود نہ رکھا جائے اور وہ پہلو سامنے
لائے جائیں جو نعت کے امکانات کو وسیع تر کردیں۔"(ص ۲۷)

صبیح رحمانی کی دوسری مولفہ کتاب "پاکستانی زبانوں میں نعت: روایت اور ارتقا"
ہے۔ مولف خود اس کتاب کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اس کتاب میں پاکستان میں بولی جانے والی مختلف زبانوں اور بولیوں میں
نعتیہ شاعری کے آغاز و ارتقا کے مراحل کے ساتھ ساتھ ان زبانوں میں
عشقِ نبی ﷺ کی تاریخ کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

(ص:۱۱)

اس میں پاکستان میں مروجہ زبانوں، پنجابی، سندھی، بلوچی، سرائیکی اور ان کی
شعری اصناف جیسے ڈھولا، کافی، ماہیا، ٹپا، سہرا، جنڈری، اکھر مکھڑا باراں ماہ، اٹھواڑا، ستواڑا
وغیرہ میں نعت کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس تاریخی اثاثے کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی
ہے۔ وفا چشتی اپنے مضمون میں سرائیکی کی شعری صنف 'ڈھولا' میں نعت نگاری کے متعلق
لکھتے ہیں کہ:

"ڈھولا" سرائیکی شاعری کی ہمہ جہت اور حد درجہ مقبولِ خاص و عام صنف
سخن ہے۔ یہ صنف جوں ہی نعت مبارک کے لمس سے آشنا ہوئی اس کے
وقار، گہرائی، گیرائی، اثر پذیری، مضمون آفرینی اور درد انگیز رس ونتا میں
بے حد و بے حساب اضافے ہوئے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس صنفِ شعر کے
اعتبارِ ذات میں ہمہ گیریت کے ساتھ ساتھ ثبات کے کئی پہلو اجاگر ہوئے
ہیں۔"(ص:۲۱۸)

میں وفا چشتی کے اس اقتباس کے آخری جملے میں ' صنف شعر کے اعتبار ذات ' کا
مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ انھوں نے 'ڈھولا' کو سرائیکی صنف کہا ہے مگر بھارت کے قدیم

راجستھانی ادب میں بھی یہ ایک موضوعی صنف شاعری ہے۔ اس میں فراق زدہ عورت کے نسوانی جذبات کے ساتھ جنگ میں گئے اپنے شوہر کے تئیں افتخار کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کتاب میں کامل القادری نے اپنے مقالے میں یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ:

"یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے ذکر سے بلوچی کی قدیم شاعری یکسر خالی کیوں ہے؟ کیا یہ قرامطی اثرات کا نتیجہ ہے یا محض ادباً بلوچی شعرا حضور ﷺ کا نام پاک لینے سے گریز کرتے رہے ہیں۔"

(ص:۱۳۴)

طاہرہ انعام نے اپنی تصنیف میں نعت کے متعلق دیگر کئی مسئلوں کو واشگاف کرنے کی کوشش کی ہے مگر کامل القادری کے اٹھائے ہوئے مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کر سکیں۔ خود مضمون نگار بھی کوئی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ حالانکہ کسی بھی قدیم زبان و ادب کی اساس میں صوفی سنتوں کے اقوال و اشعار ضرور ملتے ہیں۔ بلوچی زبان اس سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔ تو کیا بلوچی صوفی سنتوں نے محض ادباً اپنے کلام میں حضور ﷺ کا ذکر نہیں کیا؟ یہ بات تو گلے سے نہیں اترتی۔ مصنفہ نے اپنی کتاب میں اس بات کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ پاکستان کی زبانوں میں موجود نعتیہ اثاثے کو سمجھے بغیر ان پر لب کشائی یا خامہ فرسائی درست نہیں ہو سکتی۔

"غالب اور ثنائے خواجہ" صبیح رحمانی کی ایسی تالیف ہے جس میں غالبؔ کے فارسی، اردو کے کل نعتیہ کلام پر مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ یہ ۱۷۲ صفحات کی کتاب ہے اور اس میں کل دس مضامین ہیں۔ غالبؔ کی فارسی نعتوں میں ایک فارسی غزل، پانچ فارسی نعتیں جن میں دو قصائد میں ہیں، مناقب میں شامل دو نعتیں، دو نعتیہ مثنویاں بشمول معراج نامہ، مثنوی ابر گہر بار میں شامل ایک فارسی نعت اور ان کے فارسی قطعات و رباعیات۔ ان کے

علاوہ اردو میں چند نعتیہ اشعار مل جاتے ہیں۔ ان میں ایک دو اشعار ایسے ہیں جنھیں شارحین غالبؔ نے منقبت / مدح میں بھی شمار کیا ہے اور بعض انھیں نعت میں شمار کرتے ہیں۔ مثلاً

زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نواب تجمل حسین کی مدح میں لکھے گئے قصیدے کا یہ شعر ہے۔ مگر عاشقان رسول ﷺ کا اجتماعی ذوق اسے نعت میں شمار کرتا ہے۔ غالبؔ کا دوسرا شعر ہے

کل کے لیے کر آج نہ خستِ شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

غالبؔ کے اس دوسرے شعر میں 'ساقیِ کوثر' سے مراد سُنّی العقیدہ کے یہاں، حضرت محمد ﷺ ہیں اور اہل تشیع حضرت علیؓ کو ساقیِ کوثر مانتے ہیں۔ غالبؔ کے اردو کلام میں چند اشعار ایسے بھی ہیں جنھیں نعت کے زمرے میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے نظمؔ طباطبائی نے غالبؔ کے درج ذیل اشعار

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد زر و گوہر نہیں ہوں میں

کے متعلق اپنی شرح میں لکھا ہے کہ، 'ان تینوں شعروں میں صاحب معراج کی طرف خطاب کیا گیا ہے۔'

''غالب اور ثنائے خواجہ''کی بعض مشمولات مجھے تشنہ نظر آئیں۔ان مضامین میں غالبؔ کی فارسی نعتیہ شاعری پر نقد وجرح کی اور بھی گنجائش تھی۔اس کے علاوہ اس عنوان پر اور بھی مضامین شاملِ کتاب کیے جاسکتے تھے۔شاید یہی وجہ رہی ہو گی کہ طاہرہ انعام کا قلم متعلقہ تالیف کے تجزیے میں سست رود کھائی دیتا ہے۔

''کلام محسن کاکوروی:ادبی و فکری جہات''، صبیح رحمانی کی ایک اور تالیف ہے۔اس میں محسنؔ کی نعتیہ خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔محسنؔ ہندوستان کی نعتیہ شاعری کا بڑا نام ہے، لیکن ان کے قد اور مرتبے کے مطابق ان کی خدمات کو سراہا نہیں گیا۔ صبیح کو اس کا قلق ہمیشہ رہا۔اسی جذبے کو لے کر انھوں نے یہ کتاب تالیف کر ڈالی۔طاہرہ انعام نے اپنی تصنیف میں صبیح کے اس جذبے کی نشاندہی کی ہے۔

طاہرہ انعام نے '' نعت میں شعریت '' کے موضوع پر نہایت فنکارانہ انداز میں بحث کی ہے محسن کے نعتیہ کلام میں شعریت کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ لکھتی ہیں :

> ''محسن کی نعت میں '' شعریت''کا غالب ہونا ایک قابل تقلید فنی نکتہ ہے۔اسے ہر نعت گو کی ذمہ داری قرار دینا بھی غلط نہیں۔نعت کی ادبی جمالیات اس کا تقاضا کرتی ہے گویا محسنؔ کی نعت کے شعری خصائص کا یہ تذکرہ اس تالیف کو بھی نعتیہ ادب کی رہنمائی کا موقع دے رہا ہے۔ان آراء کی مجموعی اشاعت اہمیت کا یہ نکتہ رکھتی ہے کہ محسنؔ کی نعتیہ شاعری کا یہ آہنگ صنف نعت کو روحانی تہذیب کے مشترک اور مستقل سرچشموں سے اکتساب کرتے ہوئے ہر طرح کے سماجی سیاق و سباق میں نشوونما پانے کا اعتماد بخش رہاہے۔اس سے واضح ہے کہ نعت گو کی جدت ،مذہبیت کو مسخ کیے بغیر تشبیہات،استعارات، تلمیحات کا معنی افزا استعمال کر سکتی ہے۔''(ص:۵۲)

محسنؔ کی نعتیہ شاعری کے متعلق وہ یہ بھی کہتی ہیں : ’’تقلیدی ادب کے پس منظر میں ابھرتی ہوئی محسن کی جدت پسند شاعری تہذیبی، تاریخی اور عصری منظر نامے سے کلیاں چنتی ہوئی اپناالگ گلستانِ مدحت سجاتی ہے۔‘‘

مصنفہ نے محسنؔ کے مدیح خیر المرسلین پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ پر ایک ترکیب ’’ہند اسلامی تہذیب‘‘ کی استعمال کی ہے۔ یہ ایک نہایت گمراہ کن ترکیب ہے۔ اس گمراہ کن ترکیب کے دھڑلے سے استعمال پر احقر نے شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ جیسے اکابرین کو ٹوکا ہے۔ دراصل جس تہذیب کو یہ لوگ ’ ہند اسلامی کا نام دے رہے ہیں وہ یہاں کے مسلمانوں کی تہذیب کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن اس کے لیے غلط ترکیب استعمال کر لی گئی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ ہند اسلامی نہیں ہندوستان کی مسلم تہذیب ہے جس میں مقامی اثرات کی آمیزش ہو گئی ہے۔ اسے مسلم تہذیب تو کہا جا سکتا ہے اسلامی تہذیب کہنے کی اس میں قطعی گنجائش نہیں۔ خیر! مصنفہ نے محسن کے قصیدے کو ’’ ہوش مندانہ جدت‘‘ کی عمدہ مثال کہا ہے۔ یہ ترکیب اپنے آپ میں محسن کے قصیدے کی بہترین تعریف ہے۔

صبیح رحمانی کی ایک اور تالیف ’’کلامِ رضا: فکری و فنی زاویے‘‘ پر بھی طاہرہ انعام نے خامہ فرسائی کی ہے۔ صبیح نے اس سے قبل نعت رنگ کا شمارہ نمبر اٹھارا خصوصی شمارے کی صورت میں مولانا احمد رضا خاںؒ کے نام جاری کیا تھا۔ مذکورہ کتاب میں انھوں نے مولانا کے فن و شخصیت اور نعت نگاری پر مختلف ادبا و فضلا اور ناقدین کے مضامین یکجا کر دیے ہیں۔ تالیف کے مقصد کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

> ’’نقد و نظر کا ماحول ایک کھلی فضا کا تقاضا کرتا ہے جبکہ ہم نے مولانا کے گرد ایسا تقدیسی ہالہ قائم کر رکھا ہے جو شعری تخلیقات کو معروضی انداز اور ادبی

معیارات کی روشنی میں پرکھنے والے سنجیدہ اہل قلم کو اس طرف آنے سے
روکنے کا سبب بن رہا ہے۔'' (تالیف ھٰذا ص:۹)

طاہرہ انعام نے اپنے جائزے میں صبیح کے خیالات ہی کی توضیح کی ہے۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ ناقدین ادب مولانا کی تقدس مآب شخصیت سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ ان کے کلام پر انگشت نمائی گستاخی سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو تقدیسی ادب پر خامہ فرسائی کو عبث مانتے ہیں اور علمائے کرام کی ادبی تخلیقات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ چند ادیب ایسے بھی ہیں جو نقد ادب کے اصولوں کو تو بہتر طور پر جانتے ہیں لیکن عالم دین کے تقدیسی ادب پر پہلو بدل کر تنقید کرتے ہیں۔ جیسے محسنؔ کے قصیدے کے متعلق حسن عسکری کا تنقیدی رویہ۔ طاہرہ انعام نے صبیح کی مذکورہ تالیف کا جائزہ لیتے وقت مولانا کی ادبی تخلیقات پر کی گئی تنقید کے درج بالا گوشوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ خود لکھتی ہیں :

''زیر نظر تحاریر میں جابجا یہ تاثر ملتا ہے کہ مولانا کے کلام پر ادبی تنقید بروئے کار لاتے ہوئے ان کا دینی تفضل پل بھر کو نظر انداز نہیں ہوا۔ گویا فن اور ناقد کے مابین ان کی شخصیت کو اس جاہ سے ایستادہ کر دیا گیا کہ ناقد شعر کو نظر بھر کر نہ دیکھ سکے۔ یہ تالیف اس سمت ایک سعی کارآمد ہے''(ص:۶۱)

مصنفہ نے مولانا احمد رضا خاںؒ کے تبحر علمی کے متعلق ایک اہم بات کہی ہے کہ ''(ان کی) تبحر علمی نے ان کی اردو شاعری کو قرآنی آیات و احادیث سے مملو ایک تلمیحاتی فضا عطا کی ہے۔۔۔ جن کا استعمال قدرے علمیت و ریاضت کا متقاضی ہے''۔ انھوں نے مولانا کی شاعری میں استعمال ہونے والے صنائع بدائع کی وجہ سے بڑھنے والے لفظی و معنوی حسن کی اثر آفرینی کے ساتھ ہی قارئین کے وفورِ شوق اور عشق کو بڑھانے والی کیفیات و سرشاری (باطنی جمالیات) کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے جمیل جالبی کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"اس کلام کو اپنے سرھانے رکھیے اور روز ایک آدھ نعت دھیرے دھیرے اس کی کیفیات کو اپنے باطن میں سموتے ہوئے پڑھیے تو آپ رفتہ رفتہ محسوس کریں گے کہ حضرت کا کلام ہی نہیں بلکہ خود حضرت آپ سے کلام کر رہے ہیں اور روحِ عشق مصطفیٰ ﷺ آپ کے اندر جلوہ گر ہو رہی ہے۔"

(ص:٦٦)

روح عشق (اندرون کی کیفیت) کو جِلا دینے والا یہ انداز مولانا کی نعتیہ شاعری کا خاص وصف ہے اور شاعری کی شعریات کا یہ اصل الاصول ہے۔ مصنفہ نے تالیف صبیح کے مضامین میں سے مولانا کے شعری اسلوب، لسانی مطالعات، ساختیاتی پہلو، مذہبی امور، دیہی اور علاقائی زبانوں کے استعمال کے ذریعہ کیے گئے نئے شعری تجربے، غزل کے لحن و آھنگ کے ذریعہ نعت میں تغزل کا رنگ جمانے کی سعی وغیرہ پر مفصل بحث کی ہے۔

طاہرہ انعام نے صبیح کی ایک اور کتاب "اقبال کی نعت: فکری و اسلوبیاتی مطالعہ" کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی مشمولات پر مصنفہ کا جائزہ اقبال شناسی کے در واکرتا ہے۔ در اصل اقبالؔ کی نعتیہ شاعری عقیدت سے زیادہ سماجیاتی گوشوں کو اجاگر کرتی ہے۔ ان کی نعتوں کی لے اور آہنگ میں مسلم تہذیب و تمدن اور امت کے عروج و زوال کے تاریخی واقعات کی دھن بآسانی سنی جاسکتی ہے جس کی وجہ سے اقبالؔ کی نعتوں میں عشقِ رسولؐ کے دھارے امت کے لیے ان کی دادرسی کے تموج میں مدغم ہو جاتے ہیں اور اس ادغام سے جو سیلِ آب بپا ہوتا ہے وہ امت کے کشت زار حیات میں محبت و عقیدت کے پھول کھلا دیتا ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں حر کی تصور غالب دکھائی دیتا ہے۔ اپنے تساہل، جہالت اور کم مائیگی نے امت مسلمہ کو ذلت و نکبت کے جس گڑھے کے قریب لا کر کھڑا کر دیا ہے، اقبالؔ کے نزدیک اس سے ابھرنے کے لیے معراج رسول ﷺ سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آپؐ کی سنتوں کا اہتمام ہی مسلمانوں کو دوبارہ عروج کی منزل پر پہنچا سکتا ہے۔ اقبالؔ کی نعتیہ شاعری

کے مندرجہ بالا نکات کا صبیح رحمانی کی تالیف میں احاطہ کیا گیا ہے جن پر سیر حاصل بحث طاہرہ انعام نے اپنی کتاب میں کی ہے بالخصوص انھوں نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، سید عابد علی، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر جمیل جالبی پروفیسر فتح محمد ملک اور ڈاکٹر اسلم انصاری کے رشحات قلم کا حوالہ دیا ہے۔

''نعت نگر کا باسی: ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی '' صبیح رحمانی کی ایسی تالیف ہے جس میں کشفی مرحوم کی نعتیہ خدمات اور ان کی نعتیہ شاعری پر ہندوپاک کے ادیبوں کے مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔ طاہرہ انعام نعتیہ ادب میں کشفی صاحب کی تنقید اور ان کی نعتیہ شاعری پر تالیف کے مندرجات کو مرکز بنا کر بحث کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں :

> ''کشفی صاحب نے جس ادبی فضا میں نعت کو ترجیحاً اپنایا اور اس حوالے سے ثمراتِ نظم و نثر کو جس متانت سے سامنے لائے اس سے واضح ہے کہ ان کی پختہ فکر نے انھیں بیک وقت بطور شاعر اور نقاد خاطر خواہ استحکام اور اعتماد عطا کر رکھا تھا۔'' (ص:۹۰)

طاہرہ انعام نے اپنی کتاب میں اس ضمن میں پروفیسر شفقت رضوی، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر اسحٰق قریشی، پروفیسر واصل عثمانی، پروفیسر محمد اقبال جاوید وغیرہ کے مضامین پر اپنی مثبت رائے پیش کرنے کے جتن کئے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ طاہرہ صاحبہ نے نعت رنگ کے اداریوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر عزیز احسن ،ناقدین نعت کے زمرے میں بڑا نام ہے ۔انھوں نے اس مفروضے کو کالعدم کر دیا کہ، ' نعت تنقید سے بالاتر ہے۔' انھوں نے نعت سے منسلکہ عقیدت ،نعت کے لسانیاتی پہلو، نعت کی شعریات ، عروض نعت ، نعت کی سماجیات ، مسلم معاشرے میں نعت کا مرتبہ، اس کی تمدنی حقیقت، نعت کے مسلکی پہلو اور ان کی شرعی حقیت وغیرہ کئی امور پر لکھا ہے ۔نعتیہ تنقید پر ان کے مضامین مقدمے، دیباچے ،تقاریر اور مقالات کی

صورت میں منظر عام پر آئے ہیں۔ صبیح رحمانی نے انھیں یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ طاہرہ انعام نے ان مضامین کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ یہ تمام مضامین صرف عزیز احسن ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں، اس لیے تجزیہ کرتے وقت مصنفہ کو ادھر ادھر تلاش کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس تالیف کے متعلق وہ خود کہتی ہیں :

"ان مطالعات حمد و نعت سے ڈاکٹر عزیز احسن کی شخصیت کا جو مستحکم پہلو سب سے پہلے اجاگر ہوتا ہے وہ ان کی زبان دانی، پختہ شعری ذوق اور ادبی روایت سے کماحقہ آگاہی ہے۔ شعر کی فصاحت وبلاغت کن اوصاف اور علوم سے مستنیر ہوتی ہے، وہ اس کا خاطر خواہ مطالعہ اور شعری قرائن کے حسن و قبح کا علم رکھتے ہیں۔ مطالعے کی وسعت ہی کے باعث وہ لطیف اور خفیف تلمیحی اشاروں کو بھی پا جاتے ہیں۔ تنقیدی تحریروں میں ان کا یہی ذوق رہنما ہے ۔۔۔ تنقیدی تحریروں میں خود اعتمادی نے (ان کے یہاں) ایک وقار پیدا کیا ہے۔ حمد و نعت کی بات کرتے ہوئے دیگر اصناف سخن بھی ان کے تنقیدی شعور کی زد سے باہر نہیں رہتیں بلکہ بحیثیت مجموعی ادب کے باطن میں موجود داخلی ربط کا انھیں بھرپور ادراک حاصل ہے۔" (ص:۱۰۵۔۱۰۴)

مصنفہ نے حمد و نعت کی موضوعی اصناف پر کی گئی عزیز احسن کی تنقید کے مختلف گوشے سے متعارف کرایا ہے۔ بالخصوص مسلکی اختلاف میں ان کی مثبت و متوازن آراء کو نشان زد کرنے کے لیے طاہرہ نے شفافیت کے اصولوں کو برتنے کی سعی فرمائی ہے۔ نعتیہ شاعری کی تنقید کی ضمن میں مصنفہ رقم طراز ہیں :

"نعتیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں (عزیز احسن) نے شعرا کے فکر و خیال کی تطہیر، لفظوں کے قوی استعمال اور خلوصِ فن کو اجاگر کیا ہے۔ جہاں انھیں شعری دانش، دینی بصیرت سے مستنیر نظر آتی ہے وہاں وہ شاعر کی

تخلیقی رو کا حسن اپنے حسنِ انتقاد سے اور بھی واضح کر دیتے ہیں ۔۔۔انھوں نے نعتیہ کلام پر تنقید کرتے ہوئے جذبۂ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ اکتسابی علم ، احساسِ لطیف اور شعر گوئی کی وہبی صلاحیت کو موئثر نعت گوئی کے لیے ضروری قرار دیا ہے ۔۔۔ان کے نزدیک ایک نعت گو کے لیے ہے کہ شعر کی داخلی و خارجی جمالیاتی قدروں سے واقف ہو۔احساس جمال کا مظہر ہو، نیز مسلسل فنی ارتقا کا حامل ہو۔" (ص:۱۱۰ تا ۱۱۲)

مصنفہ نے عزیز احسن کے لکھے دیباچوں کے اہم نکات پر توجہ دی ہے ، مقدموں کو پرکھنے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ ان کی تقاریظ میں جھانکا ہے اور ان تینوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کو واضح کرنے میں اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لیا ہے۔

" اردو نعت میں تجلیاتِ سیرت "، نعتیہ شاعری کا اہم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی تشہیر و تبلیغ کا وقیع موضوع ہے۔یوں تو اردو نعت بالعموم مدحت رسولؐ کا سرمایہ بن کر رہ گئی ہے ۔ فی زمانہ نعت کے ذریعہ امت کی فلاح و اصلاح کے لیے وا ہونے والے دروازے مقفل نہ بھی ہوں بند ضرور پڑے ہیں،اس وجہ سے نعت میں مدحت سرائی اور تعریف و توصیف کے رنگ تو نہایت گہرے دکھائی دیتے ہیں، تعلیمات رسولؐ کی افادیت سے وہ خالی خالی ہوتی ہے۔ نعت کے موضوعات میں سیرت رسولؐ کی خاص اہمیت رہی ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس کے ذریعہ امت کی بہتر اصلاح ہو سکتی ہے ۔نعتوں کے قدیم اثاثے میں سیرت کے مضامین بہت ہوا کرتے تھے، اگرچہ ان میں ضعیف اور غیر تاریخی روایات کا اثر و نفوذ زیادہ تھا لیکن وہ افادیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ صبیح رحمانی نے انہی افادی پہلوؤں کا خیال رکھتے ہوئے تجلیات سیرت رسولؐ پر مضامین یکجا کر لیے اور اسے کتابی شکل میں پیش کر دیا۔ اس تالیف میں چار مقالہ نگاروں پروفیسر محمد اقبال جاوید، نظیر لدھیانوی، پروفیسر محمد اکرم اور گوہر ملسیانی کے مضامین / مقالات شامل ہیں۔ اقبال جاوید نے پہلے دو مضامین میں "ظہورِ قدسی"

پر بحث کی ہے۔ پہلے مضمون کے حوالے سے طاہرہ انعام کہتی ہیں کہ، ”اردو نعت کے آئینے میں“ ظہور قدسی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے نعت گو شعرا کے اختصاصات پر انھوں نے گفتگو نہیں فرمائی۔ مصنف نے شعری مثالیں نہایت فیاضی سے بہم پہنچائی ہیں لیکن تاریخی حقائق کی پیش کش کو فنی تناظر میں جانچنے کی سعی نہیں کی گئی ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ مصنف (اقبال جاوید) نے اپنے قلم سے تاریخی معلومات کو بیان کیا ہے اور بعثت سے پہلے کا منظر نامہ دکھایا ہے لیکن پیش کردہ مثالوں میں شعرا کے بیان میں حقانیت یا تاثر کی سطح کیا ہے اس پر بحث مفقود ہے۔ یہاں مصنفہ سے ایک بات عرض کرنی ہے کہ اقبال جاوید نے ظہور قدسی کے پہلے انسانیت کی زبوں حالی کے جن تاریخی واقعات کے لیے شعرا کے کلام کو بطور مثال پیش کیا ہے ان سے تاریخی صداقت کے ساتھ شعری محاسن بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔

نظیر لدھیانوی کے مضامین کے متعلق طاہرہ انعام کے تنقیدی رویے میں منفیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ پروفیسر محمد اکرام کے متعلق موصوفہ رقم طراز ہیں، ”محمد اکرم رضا نے نعت میں سیرت مصطفیٰ کی وہ کرداری اہمیت بیان کرنے کی کوشش ہے جو اس تالیف کا مطمعِ نظر ہے۔ گوہر ملسیانی کے تینوں مضامین کے متعلق بھی مصنفہ کے تاثرات منفی دکھائی دیتے ہیں۔ بہر حال! مصنفہ کا یہ اقدام جرأت آمیز ہے اور لائق مبارک باد۔

مصنفہ طاہرہ انعام کی کتاب میں آخری تجزیہ ”اردو حمد کی شعری روایت“ پر ہے۔ یہ کتاب صبیح رحمانی نے تالیف کی تھی اور اس میں اردو شاعری کی موضوعی صنف حمد اور اس کے دوسرے جزو مناجات پر مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ حمد کے متعلق ان کا فوری تاثر یہ ہے کہ، ”یہ قدیم شعری صنف ہے، جس کی موضوعاتی وسعت دلیل کی محتاج نہیں۔“ مصنفہ نے اپنے تجزیے میں حمد نگاری کو اسلامی تہذیبی قدر سے جوڑنے کی کوشش کی ہے بلکہ کتاب کے ہر مضمون کا تجزیہ بیشتر طور پر اسلامی تہذیب کے تناظر ہی میں کیا ہے موصوفہ نے کتاب کے مقدمے پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور کتاب میں درج حمدیہ شاعری کے ماخذات و حوالہ جاتی

کتب کی فہرست پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ زیر تجزیہ کتاب کے متعلق ان کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ 'اردو حمد کی شعری روایت میں شامل مضامین اردو نقد و ادب کی روایت کے مختلف مراحل سے مربوط ذہنوں کی عطا ہیں۔ یہ نکتہ بجائے خود ادبی روایت کے ہر موڑ پر حمد نگاری کی اہمیت اور جاذبیت کا شاہد ہے۔ انھوں نے حمد و مناجات کی دینی و ادبی قدر و قیمت کے مابین حد فاصل کھینچے جانے کو ناممکن کہا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ''اللہ کی تعریف بیان کرنے میں دین جس خلوص، ایمان و ایقان، حقیقی و مستحکم، قلبی و روحانی تعلق کا تقاضا کرتا ہے، ادبی اعتبار سے بھی حمد نگاری کی مقتضیات یہی ہیں'' (ص:۱۳۴) موصوفہ نے مناجات میں الحاح و تضرع کی کیفیات کی اہمیت کو مولانا ابوالحسن علی ندوی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اردو کی مختلف شعری اقسام میں حمد و مناجات کی روایت پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ طاہرہ انعام نے کتاب میں شامل تمام مصنّفین کے مضامین پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ جامعات میں تقدیسی ادب پر کام کرنے والوں کے لیے طاہرہ کی یہ کتاب یقیناً مفید ثابت ہو گی۔

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

صبیح رحمانی کی نثری تالیفات

یہ کتاب معروف نعت کار صبیح رحمانی کے مطبوعہ نعتیہ کاموں کے مطالعے پر مشتمل ہے صبیح نے گزشتہ دو تین دہائیوں میں 'نعت رنگ' کی تاریخ ساز ادارت کے ساتھ مختلف موضوعات پر جو کتابیں مرتب کیں وہ جداگانہ مطالعے کی متقاضی ہیں اس کتاب کی فہرست سے صبیح کے کام کی انفرادیت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جیسا کہ طاہرہ نے اس کتاب کے پیش گفتار میں نشاندہی کی ہے۔ صبیح رحمانی کی یہ تالیفات صاحبان نعت کے بارے میں لکھی گئی مختلف تحریروں کی جمع آوری پر مشتمل ہیں___ یہ ایک اہم کام تھا جو صبیح نے کیا جیسے جیسے نعت کو فروغ مل رہا ہے نعت کے بارے میں اس انداز کی کتابیں تالیف کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ انیسویں صدی میں کی گئی نعتیہ شاعری اور بیسویں صدی کے پہلے نصف میں لکھی گئی نعتیہ نثر کے ایک ایک جملے کو سمیٹنے کی ضرورت ہے آج کی نعت اور آج کی نعتیہ نثر کن کن تشکیلی مراحل سے گزری اور کیسی کیسی شخصیات نے نعت کے صنفی اور فنی خدوخال اجاگر کرنے میں کیا کیا کام کیا اس کا صحیح اندازہ اسی قبیل کے تنقیدی اشاروں، شذروں، تقریظوں، دیباچوں اور مضمونوں کی جمع آوری ہی سے ممکن ہے ایسی جمع آوری کسی بھی بڑے تنقیدی کام کی اولین ضرورت ہے نعت کے بارے میں تنقیدی مقالوں سے پہلے

ایسی بہت سی تحریریں کلاسیکی نعتیہ مجموعوں، دیوانوں ، مثنویوں میں دیئے گئے شذروں، تقریظوں اور کتابوں میں موجود ہیں اسی طرح پرانے اخبارات ورسائل، اکابرین کے خطوط، تذکروں میں موجود بکھرے ہوئے نعتیہ تنقیدی مواد میں کچھ ایسا مواد موجود ہے جن کو اگر بہ یک کتاب جمع کرلیا جائے تو نعت کی تحقیق اور تنقید کے کئی دَر وَا ہوسکتے ہیں۔

معاصر نعتیہ تنقید میں یہ کام صبیح رحمانی نے خوش اسلوبی سے کیا انہوں نے تقدیسی ادب سے متعلق شخصیات کے کام کو آج کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔

اس کوشش کا آغاز اس امر کا متقاضی تھا کہ ان شخصیات پر اب تک ہونے والے کاموں میں سے کچھ دستیاب اور بہتر کاموں کی جمع آوری کی جائے تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے موجود کے بارے میں آگہی ہو سکے لہٰذا انہوں نے کچھ موضوعات اور کچھ شاعروں اور ناقدوں کے بارے میں کچھ پرانی نایاب اور بکھری ہوئی تحریروں کو اکٹھا کیا کچھ نئی تحریریں ان میلانات اور شخصیات پر لکھوائیں کچھ اپنے خیال تاثرات، آرا، دیباچوں اور مضامین کی شکل میں شامل کیے۔

ان تالیفات نے ایک منظر نامے کی تشکیل کی ___ نئے ریسرچ سکالر اور ناقدین کو تقدیسی ادب کی ایک اہم پیش رفت مہیا کی یہ پیش رفت فکر انگیز بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی ___ لہٰذا صبیح کے تالیفی کاموں سے تقدیسی ادب میں تحقیق و تنقید کی ایک فضا بن گئی۔ محسن کاکوروی، احمد رضا بریلوی، مرزا غالب، علامہ اقبال کی تخلیقی مساعی کو آج کے تناظر میں دیکھنے کی ایک راہ نکلی نقد نعت میں سعی تخلیق مکرر Recreative efforts کا ایک ماحول بنا سو سال پہلے کی نعتیہ کاوشیں اپنے اندر ادبیات عالیہ کے کون سے ایسے جوہر لیے ہوئے ہیں جن کی تابانی کو وقت گہنا نہیں سکتا اور جو آج بھی اہل جذب کے دلوں کو گرماتی ہیں۔

اسی طرح ابوالخیر کشفی اور عزیز احسن جیسے معاصر ناقدین کے بارے میں اپنی تالیفات سے اہل علم کو آگاہ کیا Panging Shot کی طرح __ میں کیمرہ کی اس اصطلاح

کی یوں وضاحت کروں گا کہ جب بڑے منظر سے اختصاص کے ساتھ منظر کے کسی ایک جزو کر نمایاں کرنے کے لیے مووی کیمرہ کو Panging کر کے اسے منظر کے کسی ایک ضمنی جزو پر مرتکز کرتے ہیں تو ناظرین کی آنکھیں منظر سے سمٹ کر اس جزو پر مرتکز ہو جاتی ہیں اسی طرح ابوالخیر کشفی اور عزیز احسن کی متنوع شعری اور نثری تخلیقات وتصنیفات، مصروفیات، معمولات اور دوسری تحریروں کو پس منظر میں رکھتے ہوئے صبیح نے جب ان کی نعت گوئی اور نعت شناسی پر اپنی جمع آوری کو مرتکز کیا تو ان کی خصوصیات و خدمات نقدِ نعت نکھر کر سامنے آئیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی جن کی کم وبیش شعوری زندگی کے سال درس و تدریس میں گزرے ___ نعت کے باب میں ان کی تنقیدی خدمات کا مجھے اندازہ صبیح کی مرتبہ 'نعت نگر کا باسی' سے ہوا۔ تالیفات میں صبیح نے جن تخصصات کا خیال رکھا ہے وہ سب مائل بہ نعت ہیں __ نعت صبیح کی ترتیبی و تالیفاتی کوششوں کا محوری مقصد ہے لہٰذا صبیح کی ان کتابوں نے بحیثیت مجموعی نعتیہ تنقیدات کے پھیلاؤ میں بڑا کردار ادا کیا۔

طاہرہ انعام کا کام صبیح کی تالیفات کا جائزہ تھا ایسے جائزہ میں بڑی لچک ہوتی ہے یہ کتاب کے تعارف محض سے تنقیدی جائزہ تک کے کئی کام اپنے اندر رکھتا ہے تعارف محض میں مصنف کتابوں کے مندرجات سے اپنے قارئین کو آگاہ کرتا ہے اور انہیں کتاب زیرِ نظر کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتا چلا جاتا ہے تنقیدی جائزے میں وہ کہیں کہیں تحسینی کلمات کے ساتھ کتاب کے مندرجات کے بارے میں کوئی اضافی معلومات بھی دیتا ہے اور یوں کتابوں پر اس کا جائزہ زیادہ مفید مطلب ہو تا جاتا ہے۔

طاہرہ نے اپنے قارئین کو صبیح کی تالیفات سے بخیر وخوبی متعارف کرایا وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں جن اہل فکر کے پاس صبیح رحمانی کی کتابیں نہیں پہنچیں یا جو صبیح کی تالیفاتی خدمات کو ایک نظر، بہ یک کتاب دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بہت مفید کارآمد ہے خصوصاً اس کتاب کا آخری حصہ جو اشاریہ تالیفات پر مشتمل ہے ریسرچ سکالرز

کے لیے بہت اہم ہے ایک جگہ پر اتنی کار آمد معلومات کا ملنا تحقیق و تنقید کے مراحل میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں__ طاہرہ انعام نے کتابوں کے تنقیدی جائزے سے اشاریہ کی ترتیب تک بڑی شائستگی اور خوش سلیقگی سے کام کیا۔

صبیح رحمانی کی تالیفات کے دیباچوں کی طرح طاہرہ انعام کا دیباچہ بھی اہم ہے دونوں میں کام کرنے کا جذبہ بین السطور جھلکتا ہے ایسی نعتیہ فکر انگیز تنقیدی تحریریں مستقبل کے نعت کاروں کے لیے حوصلے کا سامان لیے ہوئے ہیں علامہ اقبال کے لفظوں میں

ع برآور، ہرچہ اندر سینہ داری

نعت کی تخلیق، تنقید، تحقیق، تعارف، تشہیر، تبلیغ اور تعارف کے لیے استعداد بھر کام کرنے کا جذبہ رُو بہ عمل رہنا چاہیے صبیح کو ان تالیفات کی ترتیب و اشاعت پر از سرِنَو مبارک اور طاہرہ انعام کو بھی مبارک کہ اس نے اپنے سندی کاموں اور تخلیقی کوششوں سے وقت نکال کر نعت کی عملی تنقید میں قدم رکھا مجھے یقین ہے اس کا اسلوب جو اس کتاب کی پیشکش میں جھلکتا ہے مستقبل میں نقد آثار کتابوں کی تصنیف و تالیف میں ظاہر ہو گا۔

قطعۂ تاریخِ اشاعت

نعت کا منظر نامۂ نو ۔۔۔ بانٹ رہا ہے ہر سو جو ضو
اس میں صبیحِ رحمانی کی ۔۔۔ سعیٔ جمیل کا بھی ہے پرتَو
اُس کی کاوشوں سے پھیلی ہے ۔۔۔ ادب میں نقد مدحت کی لو
نقدِ نعت کے باب میں اُس کی ۔۔۔ ہوئی ہے خوش انجام تگ و دو
اُس کی تاکید پیہم سے ۔۔۔ ہم سے کاہل ہوئے سبک رو
دوست ہے اس کے شہروں شہروں ۔۔۔ ملکوں ملکوں اس کے پیرو

متاثر ہے اُس کے کام سے
نقدِ نعت کا ہر اک رہرو
اس کی تالیفات کے موضوع
تازہ بہ تازہ اور نو بر نو
الف آلاف مبارک اُس کو
یہ مدحت آثار قلم رو
طاہرہ انعام احسن، تیری
نقد نعت کی تشکیلِ نو

۲۰۲۱ء

ریاض مجید

ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس، فیصل آباد

اُردو نعت کی شعری روایت

(تعریف، تاریخ، رجحانات، تقاضے)

صبیح رحمانی کی تالیفات میں یہ کتاب اردو نعت کی آبرومندی کو کس طور اجاگر کرتی ہے۔ اس ادراک کے لیے کتاب کا مطالعہ ہر دلیل سے زیادہ ضروری ہے۔ یہ کتاب میدانِ نعت میں تخلیق، تنقید اور تحقیق کے مبتدی کے لیے فکری زائچہ، مشّاق کے لیے پختہ معیار اور کاملین کے لیے انشراح وانبساط کا سامان فراہم کرتی ہے۔ کتاب کے وقیع دیباچے ہی سے کئی اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ اوّلاً یہ کہ صنفِ نعت کی بالیدگی کے لیے تنقید و تحقیق کے متغیّر معیارات ناگزیر ہیں، دوم یہ کہ موجودہ اور آئندہ ادوار میں نعت کی تخلیق و تنقید کے علمبردار اُن حدود سے بخوبی واقف ہوں جو ادب میں صنفِ نعت کے خدوخال متعیّن اور اجاگر کرتی ہیں۔ مؤلف نے بدرجہ غایت جامعیت کے ساتھ بحرِ نعت میں اُٹھتے تموّج کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے اور نعت سے متعلق تعمیری روشِ انتقاد کے نمائندگان کی عہد بہ عہد تاریخ بیان کر دی ہے۔ دیکھا جائے تو ایک طالب علم کو یہ خاکہ فراہم کر دینا بھی بیش بہا اعانت ہے۔

کتاب کا آخری حصہ اس سعی پیہم کا غماز ہے کہ مرتب نے چند گراں قدر مضامین کا انتخاب تنقید کے بحرِ ذخّار سے کیا ہے اور کُلی طور پر موثر تنقید کی حامل تحریروں کے علاوہ افکار کے اژدہام سے موئثر شذراتِ تنقید کو اُجاگر کرنا بھی ضروری سمجھا ہے۔ یہ طرزِ عمل نعت کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کی تحریک اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی اندازِ جنوں ہے جو اہلِ دانش و بصیرت کو ہم خیال بنالیتا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی یہ پیش لفظ، ادبی تنقید میں سوال اُٹھائے جانے کی ضرورت واہمیت کا بھرپور اعلامیہ ہے۔ بقول صبیح رحمانی:

> ”علم و ادب اور فکر و دانش کی دُنیا کے سارے بنیادی سوالات اور اساسی استفسارات بے شک اُٹھتے تو ایک ذہن میں ہیں یا بیان تو ایک زبان سے ہوتے ہیں لیکن ان کے پس منظر میں در حقیقت پورے ایک عہد کا شعور، ایک زندہ سماج کا ضمیر اور ایک خود آگاہ تہذیب کا نفسِ ناطقہ کار فرما ہوا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب ایسے سوالات اور مباحث سامنے آتے ہیں تو وہ فی الاصل ایک دور کی ذہنی تشکیل اور ایک تہذیب کی صورت گری میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔“ (ص:۱۳)

شامل مضامین کی موضوعی کیفیت کی بنا پر انھیں نعت کی تعریف، تاریخ، رجحانات، تقاضے کے جدول میں رکھا گیا ہے۔ حصّۂ اوّل کے مضامین مستند حوالوں سے نعت کی تعریف مہیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کا مقالہ اس کی عمدہ مثال ہے۔ مضامینِ نعت کے ماخذات پر ایمان افروز انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ نعت میں عبدیت، رسالت، حقیقتِ محمدی اور حضرت محمد ﷺ پر عطائے الٰہی سے متعلق بیان کردہ مضامین کا اوّلین ماخذ قرآن ہے، احادیث میں منقول آنحضور ﷺ کے الفاظ اور صحابۂ عظام کے الفاظ کے علاوہ مخالفین و مشرکین کے تعریفی الفاظ بھی نعت میں آپ ﷺ کے اوصاف بیان کرنے کا مبنی بر صداقت مواد فراہم کرتے ہیں۔

نعتیہ نقد و ادب میں عقائد کی تطہیر و تقطیر کے لیے ان تصوّرات کی وضاحت ضروری ہے۔ ان تحاریر سے مترشح ہے کہ نعت خوشنودیٔ الٰہی اور حبِّ رسول کے بنیادی محرّک کے علاوہ کن لوازمات کی متقاضی ہے اور ہر عہد میں نعت کی فضا کن محرکات کے تحت مخصوص موضوعی کیفیات سے ہمکنار ہوتی رہی ہے۔ اسی عمل نے نعت کو نوعی تقسیم عطا کی ہے۔ نعت کا ایک محرّک نعت کی مقبولیت ہے۔ اس ضمن میں اظہارِ خیال کے نتیجے میں فروغِ نعت کے اسباب یا دینی مجالس اور ذوقِ نعت میں اضافے کے لیے تجاویز سامنے آتی ہیں۔ یوں عوامی و ادبی ذوق کی اصلاح کا فریضہ خود بخود ادا ہو جاتا ہے۔ نیز ذرائع ابلاغ اور علمی و ادبی انجمنوں کا ذمہ دارانہ کردار اجاگر ہوتا ہے۔

اُردو میں نعتیہ سرمائے کی جو موضوعاتی تقسیم کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط نے ایک مبسوط مقالے میں اس کا احاطہ کیا ہے۔ مثلاً مولودنامہ، معراج نامے، وفات نامے، اسرائیلیات، صنمیات کے تحت ان نعتیہ اصناف کی تعریف، شعری محاسن اور تہذیب و تاریخ کے تناظر میں ان کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ''اسرائیلیات'' کے ضمن میں پیش کردہ مختصر اشارے دعوتِ تحقیق دیتے ہیں۔ یہ ایسی جرأت مندانہ تحقیق اور حق شناسی کے متقاضی ہیں جو بیشۂ تحقیق کے شیر مردوں کا خاصہ ہے۔ اسلامی ادب کے مطہّر کرنے کو یہ عمل ضروری ہے۔ صنمیات یعنی ہندو کلچر کے اثرات سے مقام ربوبیت اور مقام رسالت کو مدغم کر کے نعت میں غیر متوازن مضامین کے بیان کا ذکر ناقدین نے ہر عہد میں کیا ہے لیکن اس موضوع پر واشگاف اظہار خیال میں کئی عوامل مانع ہیں۔ مختلف مسالک و عقائد کے حامل مذہبی علماء کے نقطہ ہائے نظر کو ادبی تنقید کے اطراف و معیارات سے ہم آہنگ کرنا کارِ دگر ہے لیکن ان تحاریر میں باکمالانِ فن کی آرا کا تقابل و تجزیہ کر کے متوازن نظریات سامنے لانے کی سعی بہرحال کی گئی ہے۔ استدلال کا یہ انداز تنقید کو ایک سبھاؤ عطا کرتا ہے۔

تخلیق کار کے لیے ذہنی و قلبی تطہیر کے علاوہ ایک مثالی اسلوبِ نعت بھی لازم ہے۔ ان مضامین میں اسلوب نعت کے تقاضوں کو مذہبی استناد مہیا کیا گیا ہے۔ اس مثالی اسلوب کی تشکیل میں شاعر کی شخصیت، علم و تفضل، بلند کرداری، تقویٰ و ایمان، حبِّ رسولؐ اور سیرت النبی ﷺ سے آگہی کے تمام لوازمات کارگر ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے تخلیقی شعور کو اس آگہی سے آمیز کرتا ہے او اقدار کی بقا اور ابنِ آدم کی فلاح کے لیے اس آگہی کو عام کرتا ہے۔ فنّی مباحث کے علاوہ جمالیاتی تفکر کے ساتھ نعت کے معنوی خصائص کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اُردو نعت گوئی کے تاریخی وارتقائی جائزے میں بعض تحریروں کی حیثیت محض ایک فہرت کی سی ہے لیکن بعض تحریرین نعت گوئی کی روایت کا منظم اور باحوالہ تحقیقی جائزہ پیش کرتی ہیں۔ جس میں اشعار کی عمدہ مثالیں ذوقِ تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہیں۔ ایسے شعرا کا کلام بھی نظر نواز ہوتا ہے جن کا نام بالعموم نعتیہ شاعری کے حوالے سے معروف نہیں۔ ان مضامین میں تاریخی جائزہ اسالیبِ نعت پر اور مختلف ادوار میں مستعمل اصنافِ سخن پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ نعتیہ تاریخ کے سبھی اہم گوشے تحقیق و تنقید کی اس روشنی میں منوّر ہو گئے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مظفر حسن عالی کا مفصّل مقالہ اہم ہے۔

اردو نعت گوئی کے رجحانات کا احاطہ کرنے کے لیے تالیفی سرگرمی، تصنیف سے بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ متنوع تحاریر، متفرق رجحانات کو بہتر انداز میں اجاگر کر سکتی ہیں۔ اس حصے میں حسن عسکری کا مضمون ’’محسن کاکوروی‘‘ تنقید کا عالی قدر نمونہ ہے۔ صرف ایک شخصیت کے حوالے سے کہے گئے نکات ہی میں ضمناً فنِ شاعری اور فنِ نعت پر مفید اور موئثر اظہار کی تحریک ملتی ہے۔ نعتیہ شاعری کے رجحانات کیا ہیں؟ ان رجحانات کے عوامل و عواقب کیا ہیں؟ یہ رجحانات کیا ہونے چاہئیں؟ ان موضوعات پر جو گفتگو کی گئی اس میں بعض نکات اس قدر بھرپور دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ شعور کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ فاضل ناقدین

نے معدنِ فن سے جو نکات کشید کیے ہیں وہ نتائج ان پہلوؤں سے ماخوذ ہیں جو شاعر کی ذات ماحول اور ادبی منظرنامے کی بُنت میں پیوست ہیں۔ یہ اندازِ نظر اُس ذمہ دارانہ رویے اور ریاضت کا غماز ہے جو ادبی روایت کے تحرّک اور تموّج کو لازم ہے۔

نعت کے حوالے سے معروف ناموں کے علاوہ صبیح رحمانی نے جن ناموں کو اس فہرست میں شامل کیا ہے اس سے یہ خوشگوار حقیقت سامنے آتی ہے کہ نعتیہ تنقید کس قدر وسعت پا چکی ہے۔ شعر و ادب کے ہر پہلو سے منسلک اذہان اسے اپنے فکر و شعور میں جگہ دے چکے ہیں ان افکار کے مطالعے سے ان گنت تنقیدی جہات سامنے آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ نعت گو شاعر کے عقائد کی ماہیئت سے قطع نظر یہ امر نعتیہ تنقید میں اہم ہے کہ کیا نعت گو شاعر نے عقیدے اور فن کے امتزاج کے لیے تخلیقی عمل کو اس ریاضت سے طے کر لیا کہ جس سے ادبی جمالیات کو بھی توانائی ہو اور فن پارہ ایک تہذیبی مظہر بھی ٹھہرے؟؟؟ غرض یہ کہ ان تحاریر کا اجتماع محض انھیں پڑھ کر طاق میں سجا دینے کا متقاضی نہیں بلکہ ان گوناگوں افکار و انوار کو طالب علم، استاد، شاعر، قاری، ناقد اور محقق اپنے لیے سمت نُما جانتا ہے۔

مثبت تنقیدی معیارات صنفِ نعت کو وہ متانت عطا کرتے ہیں کہ معیاری نعت کا شاعر صحیح اکتسابِ شعور و عمل کا عکاس بن جاتا ہے۔ ادب و فکر کے تقاضاہائے جدید، نعت میں لامحدود امکانات کے فروغ کے داعی ہیں۔ ایسی مختصر، جامع اور ہمہ پہلو تحاریر اس مجموعے میں موجود ہیں جو نعت گو شاعر کے لیے ان تمام تر ذمہ داریوں کا تعین کرتی ہیں جنہیں نبھانا، نعت کو عصری تناظرات میں سرخرو کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جن کا دائرۂ کار محض فکر و خیال یا موضوعات کو محیط نہیں۔ بلکہ یہاں جملہ مقتضیاتِ نعت کا جامع بیان ملتا ہے کہ نعت جس صنفی پیکر میں تخلیق کی گئی ہو۔ اس کے فنی تقاضوں کا سنجیدگی سے ادراک اور اطلاق لازم ہے۔ نیز لکھاریوں نے تحریروں میں عربی و فارسی کے بعض اشعار کی مثالوں اور مباحث کے

ذریعے اُردو میں مستعمل نعتیہ مضامین کے حوالے سے بعض استحالات کو رفع کرنے کی سعی کی ہے۔ تازہ واردان کے لیے یہ راہِ فکر ہموار کرنا، نعتیہ ادب کے لیے امرِ استحسان ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض تنقیدی سوالات نئے مباحث کو جنم دیتے ہیں اور گزرتے وقت کے ساتھ یہ بحثا بحثی کسی نئے فکری و فنی نظریے پر منتج ہوتی ہے۔ زیر نظر تالیف کا ایک افادی پہلو یہ ہے کہ ایک زمانی بُعد میں تشکیل پانے والی تنقیدی فضا نے جو نظری مباحث چھیڑے یہاں بیک وقت ان کا مطالعہ ممکن ہے۔ نئے نقطۂ نظر کی تعمیر کا عمل موضوعات کی ندرت کو سامنے لاتا ہے۔ قدیم اشیاء اور تصورات کی تجدید کرتا ہے اور لمحۂ موجود میں قاری کو یہ تحریک دیتا ہے کہ رُک کر کسی فن پارے کا بہ اندازِ نَو جائزہ لے اور اس جہانِ معانی سے اکتساب کرے جو نعت اور ممدوحِ نعت سے متعلق عقائد میں فکری توازن لانے میں معاون ہو سکتا ہے۔ توازن اور ارتقاء کی یہی خواہش اور ضرورت جدید نعت کو تونگر بنا رہی ہے۔ عارف عبدالمتین کے بقول:

> ”جدید نعت آنحضور ﷺ سے جذباتی اور احساساتی تحرّک کا فیضان حاصل کر کے اپنی فنی سطح کو ارفع تر بناتی ہے اور اس کی تخلیقی گرفت کو مضبوط تر بناتی ہے۔ وہاں آنحضور ﷺ کی سیرت کے پیکر زرّیں سے اکتسابِ نور کرتی ہے اور ان کے کردار کے گوناگوں اوصافِ حمیدہ سے اور عمرانی حوالے سے ان کے افعال و اعمال کی نوعیت اور وقعت کا ادراک کر کے آشوبِ ذات اور آشوبِ کائنات پر قابو پانے اور ان کا مؤثر سدِّباب کرنے کے طریقے نہ صرف خود سوچتی ہے بلکہ دوسروں کو بھی سمجھاتی ہے اور یوں انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر فروغ و ارتقا کی راہیں کھول کر شخصی، مِلّی اور بالآخر انسانی نشوونما و ارتقا کے امکانات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے میں گراں قدر معاونت کرتی ہے۔“ (ص:۳۰۷)

جدید نعت روایتی تقلید کے بجائے جو فکری تجدّد اور تطہیر چاہتی ہے اس کے لیے نعتیہ ادب میں موجود سوالات پر بحث اور نئے سوالات کا ادعا اور بالغ فکری کے ساتھ موازنہ و تقابل ضروری ہے۔ نعتیہ تنقید کو سوالات میسر کرنے کا یہ عمل محض ریاضیاتی یا معروضی انداز کا حامل نہیں بلکہ ناقدین نے افکار کے بیان میں اس زمانی تسلسل کو بھی ملحوظ رکھا ہے جو اجتماعی تخلیقی لاشعور کے قدم بہ قدم مطالعے کو پیش کرتا ہے، اس دھارے میں شریعت اور ادب کہیں متوازی، کہیں مدغم اور کہیں متصادم دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی کا مضمون ''نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم'' ان تحریروں میں شامل کیے جانے کے لائق ہے جو نعت گوئی کے اطراف و جہات کو زبان و بیان کے متقدم روایتی مگر ٹھوس معیارات اور رجحانات سے آگہی فراہم کرنے کے علاوہ جدید اسلوبیاتی میلانات اور امکانات سے وابستگی کا شعور بھی عطا کرتی ہیں۔ صنفِ نعت میں اُردو زبان نے ادبی اظہاریے میں بے بہا معنیاتی جودّت دکھائی ہے۔ اہم حوالوں سے اس کا تذکرہ کرنے کے بعد، مربوط مباحث کے ذریعے نعت کی جانب خالصتاً ادبی رویہ اپنانے کا فریضہ تخلیق کار اور ناقد دونوں پر عائد کیا گیا ہے۔ بنیادی مباحث سے پیوست ضمنی سوالات ناقدین کی انفرادی وسعتیں سامنے لاتے ہیں جو پڑھنے والے کو وسیع تناظر فراہم کر رہی ہیں۔

نعت پر تنقید میں اضافہ کرنے سے کہیں زیادہ ضروری نعتیہ تنقید کا شعور پیدا کرنا ہے۔ مجموعی ادبی تناظرات سے ہر صنف کے موافق معیارات کو بہ نظر ہُنر کشید کر لینا کیونکر ممکن ہے؟۔۔۔ کشفی صاحب کی تحریروں میں بڑی سہجتا سے یہ تعلیم کر دی گئی ہے۔ جس کے تحت زبان و ادب اور دیگر سماجی تصورات باہم منسلک اور متعلق دکھائی دیتے ہیں اور معانی کے تعیّن کا مسئلہ فکری ریاضت کو کشادگی بخش دیتا ہے۔ لفظ کی ادبی حیثیت اور قدر و اہمیت کا بہ سند اور باسہولت ادراک پانے کے بعد اس نوع کی تحریریں یہ وضاحت کرتی ہیں کہ اظہارِ نعت مختلف اصناف میں ڈھلتا ہے تو اس کا باعث ترسیلِ معنی کی ایک غیر محسوس تحریک ہے۔۔۔ جو

شاعر کی ذہنی اپج اور ادبی روایت سے مل کر تخلیقی سانچے کا فیصلہ کرتی ہے۔۔۔ یہ شعور یابی تازہ نعت گویان کے لیے سعادت ہے جو انھیں اس اسلوب سے بچائے رکھے گی جو سطحی ہے اور جس کا مقصد محض چونکا دینا ہے۔ نعت کے فکری سفر کو اجتماعی شعری روایت سے جدا کر کے دیکھنا کارِ ناقص ہے۔ اس سفر میں متنوع مراحل پر نعت میں در آنے والے قابلِ اصلاح عوامل سے واقفیت ضروری ہے ان کے اتباع کی گنجائش اس کتاب کے مطالعے کے بعد معدوم قرار پاتی ہے۔

مبین مرزا نے اُردو شاعری میں نعت گوئی کے بنیادی خطوط کی نشاندہی کرتے ہوئے اجتماعی تہذیبی وسیاسی رویوں میں نعت گوئی کے شعور کی تلاش کی ہے۔ اس کے زیر و بم کو سمجھا ہے اور مخصوص رجحانات کے پسِ پشت کارفرما اجتماعی تجربات کا تجربہ کیا گیا ہے۔ جو نعت میں موضوعات کی تبدیلی کا باعث بنتے رہے ہیں۔ ماحول سے اکتساب کا عنصر شعوری اور لاشعوری طور پر تخلیق کار پر اثر انداز ہوتا ہے یوں بدلتے ماحول نے نعت کو بھی جدید استعاراتی و علامتی عناصر عطا کیے۔ اس ضمن میں پیش کردہ نکات کے تحت نعت گو شاعر سے ہمہ گوں دلچسپی، فکری و فنی پختگی، روایت سے اکتساب کے ذوق اور تازہ کاری کے شوق کی توقع کی گئی ہے۔ انسان کی تہذیبی تاریخ میں مذہبی شاعری کی تخلیق اور ارتقا کا سراغ لگاتے ہوئے نہایت اہم سوالات اُٹھائے گئے۔ اُن کے ہاں نعت اور اُردو کی شعری تہذیب کے حوالے سے قابلِ قدر تجزیات ملتے ہیں۔ ان کے سوالات ارتقائی انداز میں شعور کی سمت متعین کرتے ہیں۔

> ”ہمارے شعری اُفق پر جذبہ و فکر کی جو کہکشاں ضوفشاں دکھائی دیتی ہے اس میں سب سے نمایاں رنگ مذہبی طرزِ احساس کا زائیدہ ہے۔۔۔ اور ہمارے مذہبی احساس کی تشکیل میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ نے۔۔۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو کیا ہماری غزل کی

روایت اپنے عمومی اظہارات میں، یعنی مذہبی طرزِ احساس کے بغیر بھی عشقِ رسول ﷺ کی جہت کو اُجاگر کرتی ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کرتی ہے تو اس اظہار و بیان کی سطح کیا بنتی ہے؟ کیا ایسا کوئی شعر جس میں یہ احساس اور یہ جذبہ نمایاں ہوتا ہے، بعد ازاں مذہبی شعر بن جاتا ہے یا پھر یہ اظہار اس شعر میں اضافی قدر کی حیثیت رکھتا ہے؟ اس ضمن میں تیسرا سوال بھی اہم اور بہت غور طلب ہے اور وہ یہ کہ شعر میں اس جذبے کا اظہار کیا شاعر باضابطہ فکر کے ساتھ اور دانستہ یعنی شعوری سطح پر کرتا ہے یا تہذیبی لاشعور اس فکر کو اس کے فن میں راہ دیتا ہے؟" (ص:۴۴۲)

جدید ناقد مختلف اصنافِ ادب کے داخل سے ہوتا ہوا اس تخلیقی خمیر کو کھوجتا ہے جس سے نعت نے جنم لیا۔ تاریخی مطالعے کی معاونت میں، قرآن و سیرت سے نمو پاتا ہوا، اسلامی فکر و احساس ادب میں مذہبی اظہار کا کیسا بدیع جائزہ پیش کرتا ہے۔ جسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ادبی تنقیدی رجحانات کے کئی نہایت اہم اسباب ہیں جن کی صراحت کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس مطالعے کے بعد عشقِ رسول ﷺ کو تہذیبی و ادبی روح میں جاگزیں پا کر، قلب و نظر ایک سرشاری سے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ سرشار نظر ادبی سرمائے کو اس حوالے سے ٹٹولتی ہے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ جو جذبہ نعت کی تخلیق کا محرّک ہوتا ہے اس پر مخصوص اذہان کا اجارہ نہیں، ہر صنف سے وابستہ تخلیق کار کے شعور میں یہ عنصر کار فرما ہے۔ شمیم احمد نے اجتماعی، سیاسی رویوں میں نعت گوئی کے شعور کی تلاش کی ہے۔ اس نے زیر و بم یا مدوجزر کو سمجھا ہے۔ احمد ہمدانی کی تحریر سے جدید انداز و اسالیب سے متعلق شعر فہمی کا شعور جھلکتا ہے۔

بعضے مقامات پر ان اسالیبِ تحریر کی بلند آہنگی عام ذہنی سطح میں سرایت کر جانے والی نہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پُر مغز تحریر کو سمجھنے کی کوشش ایک باثمر

ذہنی کاوش ہے جس کے تحت چند مخصوص اذہان کا افہام بھی، اہم فکری نکات کو اپنے اپنے دائرہ ہائے کار میں اثر پذیری کے قابل بنائے گا اور ان نکات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے اگر انہی نکات کو تفصیل اور تسہیل سے سامنے لایا گیا تو یہی تحاریر اس وسعت کا محرّک ہوں گی اور نعت ہی نہیں دیگر اصنافِ ادب کے عمیق مطالعے میں معاون ہوں گی۔

مطالعۂ نعت کے ضمن میں فکر انگیز سوالات سے، احیائے شعور کا اعجاز دکھانا، مسلسل ارتقاء پذیر روایت سے اشعار کا زبردست انتخاب فراہم کرنا، ہماری شعری تہذیب کی آئینہ دار اصناف بالخصوص غزل کا نعت سے باطنی ربط اجاگر کرنا، نعت کے متعین موضوعات میں بھی نئی بات کہنے کو لازمۂ نعت قرار دینا، ان مضامین کا ادعا ہے۔ نعت میں بصیرت اور حساسیت کا فروغ عشق اور عقیدت کے راستے کیونکر ممکن ہے، اس تعلیم کو ناقدینِ نعت نے اپنی ذمہ داری سمجھا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے نعت کے بارے میں جن روایتی اور غیر روایتی معروضات کو پیش کیا ہے یہ نکات تعلیمِ نفسی میں عشقِ نبی ﷺ کی محرکاتی قوت کو مربوط، منظم اور دلکشا انداز میں بیان کرتے ہیں:

> "عشقِ نبی ﷺ کی وارفتگی و دیوانگی دراصل ایک ایسی مقدس تجرید، ایک مابعد الطبیعیاتی مگر عظیم الشان تصوریت کو مرکز بناتی ہے جسے پورے طور پر انسانی ذہن گرفت میں لینے سے قاصر ہوتا ہے۔ یوں عاشق کے لیے ہر پیراڈاکسیائی صورتحال پیدا ہوتی ہے اس صورتحال کا ایک رخ یہ ہے کہ اس تجرید کو اس الوہیت سے جدا رکھنا ہوتا ہے جو صرف خدا سے مخصوص ہے۔۔۔ عشقِ نبی ﷺ کی پیراڈاکسیائی صورتحال کا ایک اور رُخ یہ ہے کہ ایک طرف وہ عشق کا سچا، گہرا جذبہ محسوس کرتا ہے، مگر اپنے محبوب کا تصور ایک مقدّس تجرید کے طور پر کرتا ہے۔ پیراڈاکس یہ ہے کہ جذبہ سامنے، حقیقی طور پر حسی وجود پر مرتکز ہونے کے بجائے تصوریت سے وابستہ ہوتا

ہے اسی پیراڈاکس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عاشقِ رسول ﷺ کو ایک طرف اپنی خاکی نہاد کا منکسرانہ احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ ایک عظیم الشان مابعد الطبیعی تصوریت پر اپنی تمام حسی و مرکزی صلاحیتوں کو مرکوز کرتا ہے مگر یہی پیراڈاکسیائی صورتحال اس کے عشق کو ایک عجب ذائقہ، ایک انوکھی بلندی اور اس کے دل میں نئی آرزوئیں پیدا کرتی ہے۔ عاشق اپنی خاکی نہاد کا منکسرانہ احساس تو رکھتا ہے مگر اسے حقیر بے معنی بے مصرف و بے مقصد نہیں سمجھتا۔ جو خاکی وجود ایک عظیم الشان تجرید کا تصور کر سکتا ہے وہ حقیر کیونکر ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں نعت سمیت، دوسری مذہبی شاعری جدید شاعری سے الگ ایک راستہ اختیار کرتی ہے۔" (ص:۴۶۹)

نعت گو شاعر ان بلند مناصب کا اہل ہو کر ایک آرزومندی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ مباحث کسی نقطۂ فکر پر منتج ہو کر درِ شعور بند نہیں کرتے بلکہ سوچ کے نئے افق دکھاتے ہیں۔ قاری کی سوچ "ھل من مزید" کے دھارے میں بہتی ہے اور معنویت کی ترسیل ایک تسلسل بن جاتی ہے۔ مثلاً پروفیسر سمیع اللہ قریشی کی تحریر "نعتیہ رویہ" سے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ہر عہد میں نعتیہ موضوعات کی پیدائش خارجی ماحول سے جڑی تھی؟ یہ دیکھنے کو قاری خود روایت کے مطالعے کی تحریک پکڑتا ہے اور بحرِ روایت کی شناوری معانی کے گوہر ڈھونڈ لاتی ہے۔

بعض تنقیدی موضوعات بظاہر یک رُخے ہونے کے باعث نئی بحث کی بنیاد بنتے ہیں۔ جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں صنفِ نعت کو پرکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر عزیز احسن نے قاری اساس تنقید کے تحت غزلیہ شاعری میں معنیاتِ نعت کا پرتو دکھانے کے لیے قدیم متون کا جدید تناظرات میں مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کاشف عرفان نے اُردو نعت نگاری پر مابعد

جدیدیت کے اثرات کا جائزہ تمام تر تاریخی و تہذیبی اور ادبی حوالوں سے پیش کیا ہے۔ اگر حوالے مکرّر درج ہوتے ہیں تو ہر مقام پر اپنے سیاق و سباق میں ایک نئی معنویت دیتے ہیں۔ یہ تنقیدی منظر نامہ نعت گو کے لیے مذہب، سائنس، مابعد الطبیعیات تاریخ اور سماج کے تمام سرچشموں سے مواد فراہم کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کے نعت گو کی ذمہ داریاں متعین کی گئی ہیں جو متذکرہ بالا حوالوں سے اکتسابِ فکر و نظر کے بعد تعمیرِ انسانیت کے کامل تصورات پیش کر سکتا ہے۔ دائرہ، اکتساب کو وسیع کرنے کے لیے قرآن و سیرت کے لازمی مطالعے اور ترجمہ نگاری کو ضروری قرار دینا، ایسی انقلابی آراء ہیں جو نعتیہ ادب کو عروج آشنا کر سکتی ہیں۔

جہاں اسلوبِ تحریر معروضی تنقید کے بجائے جذباتی احساس کا مظہر ہے۔ وہاں بھی خیر اور اُمید کا یہ پہلو مضمر ہے کہ جدیدیت نا آشنا اذہان لفظوں کے اژدہام سے روایتی حظ اُٹھاتے ہوئے ناگاہ کسی نکتۂ نو سے متعارف ہوتے ہیں اور شعور کی تحریک پاتے ہیں۔ یوں فکری بُعد کے مٹنے کا سبب پیدا ہوتا ہے۔ نعت کے لہجوں کا عصریت میں سراغ لگانا اسلوبی عناصر کا نفسیاتی جائزہ لینا اور پھر اسالیب کے تنوع اور ندرت کو بطور مقتضیاتِ نعت وسیع تناظر میں بیان کرنا۔ نعت گو کے ذہن کی ادبی تربیت کرتا ہے۔ عالمی ادب کے حوالے سے فکر و نظر کی آبیاری ہوتی ہے۔

صنفِ نعت کے تقاضوں کا بیان ایک مختصر حصے میں بیشتر مباحث کو سامنے لاتا ہے۔ اردو نعت میں ہیئت کے تجربوں کی ضرورت و اہمیت کے علاوہ نقدِ نعت کے لیے فنی سانچوں اور عصری حوالوں سے اکتساب کی ضرورت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں متحرک شخصیات کا تذکار اور تحسین کئی ذہنوں کو اس طرف راغب کر سکتے ہیں اور اس اثر پذیری سے اب تک ایسے نام سامنے بھی آ چکے ہیں جنھوں نے نعتیہ تنقید میں اہم اضافے کیے ہیں اور خود سوال قائم کرنے کا اعتماد فروغ پذیر ہوا ہے۔ نقد نعت کے عصری تناظر کے

علاوہ مستقبل کے امکانات پر بھی بات کی گئی ہے۔ یہ مباحث نعتیہ تنقید میں فکر و فن، عقیدت، عقیدہ، سماجی شعور اور سبھی ادبی ولسانی تقاضوں کو جگہ دیتے ہیں۔

تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیقِ نعت کے محرکات اور لوازمات سے شناسائی کی وہ فضا یہاں میسر ہے جس سے مبتدی اور مشّاق متعلقینِ نعت یکساں طور پر بہرہ مند ہوں گے۔ ڈاکٹر سید معین الدین عقیل نے اعلیٰ تحقیقی معیار کے حامل مثالی نمونوں پر نظر کی ہے۔ موضوعاتِ نعت پر تحقیق کے لیے کن ترجیحات کو مد نظر ہونا چاہیے اس امر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مثالوں کے ذریعے جو کسوٹی قائم کی گئی ہے۔۔۔ مستقبل میں اس پر سوالات اُٹھانے کے دوران مزید نئے موضوعات دریافت ہوں گے۔ نیز جن موضوعات کی نزاکت محققین اور ناقدین کو خائف رکھتی ہے ان پر بات کرنے سے ممکن ہے کہ یہ کم سطح کے ذہنی مناقشات بہتر فکری فیصلوں اور تجزیوں میں بدل جائیں۔ بقول ڈاکٹر سحر انصاری:

> ”نعت کی بہتر اور وسیع پیمانے پر تقسیم کے لیے اپنا کردار موثر طور پر ادا کرنے کے لیے ناقدین کو آج کچھ تقاضوں کو شعوری سطح پر دیکھنا ہو گا۔ نعت کی تنقید کو اس وقت جن تقاضوں کو ملحوظِ نظر رکھنا چاہیے۔ ان میں ایک تو یہ ہے کہ اب اسے محض عقیدت کا معاملہ نہ سمجھا جائے بلکہ عقیدت و محبت کے اظہار کو بھی ادب کے فن اور اس کی جمالیات کے معیار پر قبول کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس ضمن میں جس افراط و تفریط سے کام لیا جاتا رہا ہے اور جس کی گنجائش مسالک کے عنوان سے پیدا کر لی جاتی ہے۔ اب اس کو بھی قطعیت کے ساتھ دیکھا جانا چاہیے اور اس کے لیے ناقدانہ شعور کے ساتھ فیصلے کسی رورعایت کے بغیر صادر کیے جانے چاہئیں۔“ (ص:۵۶۰)

نعت اور نقدِ نعت سے متعلق ڈاکٹر اسحاق قریشی کی پیش کردہ گزارشات میں مذہبی تاریخ سے ایسی رہنمائی کی تحریک دی گئی ہے کہ تاریخ کے ہر موڑ سے شعور و عمل کے معیارات کشید کر لیے جائیں اور نظریاتی توازن کو بہر حال مقدم رکھا جائے۔

مختصر یہ کہ ان تحاریر سے معروضی انداز میں نقدِ نعت کے لیے رہنمائی کی گئی ہے جس سے حقائق آشنارویوں کو فروغ ملتا ہے۔ اُردو کے کلاسیکی حوالوں، عربی، فارسی حوالوں، حتیٰ کہ نقدِ نعت کی مثال میں قصیدہ بانت سعاد کے ایک مصرعے میں آنحضورﷺ کی تبدیلی۔۔۔ جیسے تاریخی حوالوں سے فکری اکتساب ہر عہد میں لازم ہے۔ مجموعی ادبی معیار کو سامنے رکھ کر متوازن رائے قائم کرنے کا شعور لازم ہے جو نعت گوئی کی حوصلہ شکنی کا باعث نہ ہو۔ نعت کے ادبی حسن کے لیے وہ سبھی پیمانے لیے جاتے ہیں جو دیگر اصناف کے لیے ہیں یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ نعت کو ایک وقیع صنفِ سخن کا اعتبار حاصل ہے۔ نعت پر کڑی تنقید ضروری ہے بشرطیکہ سیاق و سباق کو محدود نہ رکھا جائے اور وہ پہلو سامنے لائے جائیں جو نعت کے امکانات کو وسیع تر کر دیں۔

پاکستانی زبانوں میں نعت: روایت اور ارتقا

کسی معاشرے کے تہذیب و تمدّن کو سمجھنے کے لیے بالعموم اس کے ادب کے مطالعے کو اہم سمجھا گیا ہے۔ اس مطالعے کی نہج کا تعین اس بات کے تابع ہے کہ معاشرہ تہذیب و تمدن کے مادی و روحانی پہلوؤں میں سے کس کو مقدم رکھتا ہے۔ اس تناظر میں خصوصاً نعتیہ شاعری کا مطالعہ اسلامی محور کے حامل معاشروں میں اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ پاکستانی زبانوں میں ابلاغِ فکر و نظر کی صلاحیت مسلّم، لیکن زیرِ نظر کتاب کا مقصد ان زبانوں کی تخلیقی رَو یا ادبی سرمائے میں جاگزیں جذبۂ عشق رسول ﷺ کو اجاگر کرنا ہے۔

پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں کی تاریخ اور ان کے ادبی ارتقا سے متعلق معلومات ان مضامین کا حصہ بنی ہیں۔ ان ادبی روایات میں نعت کب طلوع ہوتی ہے۔ کیا رنگ و آہنگ اختیار کرتی ہے اس کا عہد بہ عہد تذکرہ ملتا ہے۔ ابتدائی دور میں ادب کی دیگر تصنیفات کے ذکر سے ہر عہد کے اسلامی ادب پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ادب کے نقوش ہر زبان کے ابتدائی ادب میں مشترک حوالوں ہی سے نمودار ہوتے ہیں اور سب زبانوں میں ادبی ارتقا کے ایک سے عمل سے گزرتے ہیں اور جِلا پاتے

ہیں۔ بتدریج یہ جائزہ دیگر ادوار کو محیط ہوتا ہے اور ہر زبان کے نعتیہ ادب کا ایک منظر نامہ قاری کے ذہن میں نقش ہوتا ہے۔بقول صبیح رحمانی:

> ''اپنی اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود ان زبانوں میں ایک ایسی مشترکہ گونج سنائی دیتی ہے جسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ گونج دراصل اظہار ہے اس بنیادی فکر کا جو ان زبانوں کے لیے اُس جوہر کی فراہمی کا وسیلہ ہے جو ان افراد کے مزاج سے لے کر اجتماعی اور ثقافتی مظاہر تک ایک خاص حسیت کی تشکیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ چنانچہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں کا نظریۂ حیات تہذیبی روایات اور روحانی و اخلاقی قدریں دراصل ایک مشترک ماخذ رکھتی ہیں۔۔۔ان کے ادب کا بنیادی حوالہ اسلام، اسلامی ثقافت اور سب سے بڑھ کر عشقِ نبی کریم ﷺ ہے اور یہی وہ حوالہ اور فکری اساس ہے جو پاکستان کے تمام علاقوں میں بسنے والوں کو اپنی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کا محافظ بناتی ہے اور اس سطح پر یکجان کرتی ہے۔''(ص:۸)

گویا عقائد و نظریات مشترک ہونے کی صورت میں لسان و ادب کے سلسلے کسی قوم کی زبانوں میں مربوط رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ مقامی ثقافتی عناصر کے جزوی فرق کے باوصف ان کی روح ایک ہوتی ہے۔ عشقِ نبی ﷺ ایک اہم ترین روحانی عنصر بن کر مسلم معاشروں کے ادب میں بلا تخصیص زمان و مکان جاری و ساری ہے۔ اسی امر سے ادبی پیرایہ ہائے اظہار یعنی استعارات و کنایات اور علائم و رموز نے اشتراک پایا ہے۔ لہٰذا تمام زبانوں سے منتخب نعت پارے یکجا کیے جائیں تو اس ایناس کی پیدا کردہ جاذبیت سے انکار ناممکن ہو گا۔ عربی، فارسی، اردو سے ہوتے ہوئے یہ خارجی و باطنی اوصافِ نعت، وطنِ عزیز کی تمام زبانوں میں جاگزیں نظر آتے ہیں۔

اگرچہ بیشتر مضامین کی نوعیت تعارفی یا معلوماتی ہے، بالاستیعاب تنقیدی جائزہ میسر نہیں آتا لیکن بعض مقامات پر نعت کے رجحانات کا عصری تناظر میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ مثلاً نعت کے ابتدائی خدوخال کی تفہیم کے لیے صوفیا کرام کی شاعری براہِ راست نعت نہ ہوتے ہوئے بھی بہت اہم ہے۔ یہ وہ پس منظری حوالہ ہے جس کے تحت آئندہ نعتیہ شاعری کا تجزیہ ممکن ہے۔ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی لکھتے ہیں:

"ان کی کافیوں اور شلوکوں وغیرہ میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ تمام تر اسلام کے ابدی پیغام کی تشریحات ہی تو ہیں چنانچہ نعت کا ابتدائی سرمایہ جو زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہو کر ہمارے عہد تک پہنچا ہے وہ نعت کے ابتدائی خدوخال کی تفہیم کے سلسلے میں بڑا اہم مقام رکھتا ہے۔" (ص:۲۹)

انگریزی دور کے نعت گو شعرا کے متعلق ان کی رائے ملاحظہ کیجیے:

"ان شعرا کی تحریریں بہر حال انگریز اور اس کی تبلیغی مساعی جو وہ عیسائیت کے فروغ کے لیے کر رہا تھا، کا ردِّ عمل بھی ہے چنانچہ ایسے ماحول میں جب اسلام کی بات ہو گی تو لوگوں کی اخلاقی اور سیاسی تربیت کے کام کو آگے بڑھایا جائے گا ظاہر ہے کہ یہ کام نبی کریم ﷺ کی سیرت و شخصیت ہی کے حوالے سے ہو سکیں گے۔ چنانچہ غلامی کے اس دور میں نعت کا کینوس بھی وسعت اختیار کرتا ہے۔" (ص:۳۴)

اسی طرح کامل القادری نے بھی (ص:۳۵) تجزیات کی روشنی میں بلوچی ادب میں نعت کی شمولیت کو دُرخانی مدرسۂ فکر کے شعرا کی عطا قرار دیا ہے۔ بلوچی شاعری کے متعلق ان کی مجموعی رائے بھی سماجی و تہذیبی تناظر میں تنقید کی اچھی مثال ہے:

"بلوچ شخصیت پرست نہیں۔ لہٰذا جب وہ حضور ﷺ کی ذاتِ والا صفات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے ان اوصاف کو بیان کرتے ہیں جن سے انسانیت

میں تازہ کاری پیدا ہوتی ہے وہ فارسی اور اردو شعرا کی طرح سراپا نگاری سے گریز کرتے ہیں نیز وہ مجازی عشق کے اندازِ بیاں یعنی غزلیہ ڈکشن (Lyrical diction) کو نعت میں بروئے کار نہیں لاتے وہ اسوۂ حسنہ کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں لہٰذا بلوچی کی نعتیہ شاعری میں وہ افراط و تفریط نظر نہیں آتی جو اُردو اور فارسی یا عربی کے نعتیہ کلام میں پائی جاتی ہے۔"(ص:۱۴۸)

نعت کی روایت نے ہر اُس زبان میں فطری ارتقاء پایا ہے جسے مسلمان کسی نہ کسی علاقے میں بولتے ہیں ان زبانوں کی ابتدائی شعری روایت کا جائزہ بھی، کم از کم موضوعات کی حد تک مشترک نتائج ہی سامنے لاتا ہے۔ مذکورہ تمام زبانوں میں قصے کہانی کے آغاز میں تبرّکاً حمد و نعت شامل کرنے کے علاوہ مولودنامے، حلیہ شریف، معراج نامے، شمائل نامے، وفات نامے، غزوات، معجزات، مدح، مناجات، منظوم سیرت اور کلاسیک عربی و فارسی منظومات کے تراجم موجود ہیں۔ البتہ مقامی ثقافت کے کچھ فرق کے باعث کہیں کہیں تاج نامہ، بارات نامہ، ہدہد نامہ، طوطا نامہ، جوگی نامہ، درود نامہ، مسیت نامہ اور نصاب بھی مستعمل رہے ہیں۔ یہی مقامی فرق ہیئتی اصناف کے تنوع میں بھی موجود ہے۔ مثنوی، غزل، پابند ہیئتی نظموں کے علاوہ پنجابی میں کافی، سی حرفی، دوہڑہ، گلزار، باراں ماہ، اٹھواڑہ، ستواڑہ، مسدس، مخمس، ڈھولا، مہندی سہرا، جنڈری، ماہیا، بولی، ٹپا، اکھر مکھڑا۔۔۔ سندھی میں بیت، وائی یا کافی، الفا اشباع، مناظرہ، یٹھ اکھری (تیس حرفی) سگھڑ، نڑ کے بیت مثنوی، مسمط۔۔۔ بلوچی میں لقا، دستانغ۔۔۔ پشتو میں ٹپا، چار بیتوں، بدلوں، سرائیکی میں کافی، بارہ ماہ، گھڑولی لعل، تورہ، سی حرفی، نعتیہ ڈھولے، نعتیہ سہرے۔۔۔ کشمیری میں ونہ ون اور چار بیتہ رائج ہیں۔ اس جائزے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ نعت کے تقدس اور لفظیات سے متعلق حزم احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ نغمۂ روح ہر ہیئت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ ہم دیکھتے کہ بتدریج ارتقائی عمل نے

ان زبانوں کے نعتیہ ادب کو سبھی قدیم و جدید جہات سے آشنا کر دیا ہے۔ ان جدید عالمی رجحانات کی نشاندہی بھی ان تحریروں میں نظر آتی ہے کہ ان زبانوں کے شعرا نے ثقافتی تشخّصات کے باوجود صنفِ نعت کو مقامیت سے بالاتر ایک آفاقی پیکر دینے کی سعی کی ہے۔

عشقیہ لوک داستانیں ہر معاشرے کا اہم مقامی عنصر ہیں لیکن اجتماعی لاشعور میں موجود عشقِ نبی ﷺ کی حدّت تمام علائم و رموز کو دہکا رہی ہے لہٰذا یہ علامات محض عشقِ مجازی کی مظہر نہیں ہیں بلکہ شاعر ذاتِ آنحضور ﷺ کی آفاقیت اور جامعیت کو ان علامات کے توسط سے بیان کرتا ہے۔ مقامی زبانوں میں موجود نعتیہ سرمائے کی جمالیاتی قدر و قیمت اجاگر کرنا ضروری ہے جس طرح بے شمار ذہنوں کے لیے زبان و تہذیب سے ناآشنائی کے باعث، عظیم عالمی فن پاروں سے کماحقہ' لطف اندوزی ممکن نہیں اسی طرح اپنے وطن کی ان زبانوں سے بیگانگی کو ہم ان زبانوں کے ادبی سرمائے کی بے بضاعتی پر محمول نہیں کر سکتے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ان مضامین میں بطور مثال پیش کیے گئے تراجم اگر دلی تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہیں تو اصل تخلیقات کس قدر جمالیات کی حامل ہوں گی۔ تراجم کی اہمیت ہر زبان و ادب اور تمام اصناف کے لیے مسلّم ہے لیکن یہاں بالخصوص اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ عالمی تراجم کی طرح اپنی ملکی زبانوں کے تراجم کی کوششیں بے حد بار آور ہو سکتی ہیں یہ تراجم بتاتے ہیں کہ ہمارا اجتماعی ضمیر اور خمیر ایک ہے۔ ان زبانوں کی تخلیقات کا دیگر زبانوں میں ترجمہ، سریع استفادے کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔ ان نعتیہ افکار و مضامین سے آشنائی ہوتی ہے جو مختلف ادوار میں مختلف سطحوں پر کبھی جداگانہ اور کبھی بصورتِ ادغام سامنے آتے رہے ہیں۔ ان متنوع جہات کا جائزہ آئندہ امکانات کے فروغ کا ایک زینہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زیرِ نظر تحریروں میں دیے گئے بعض تراجم کی مثالیں دیکھیے:

محبوب کی ماہیت بالکل عجیب ہے
اس کو خدا بھی نہیں کہا جا سکتا اور مخلوق بھی نہیں

وہ شفق کی مانند ہے جو دن اور رات کی جامع ہوتی ہے

(خواجہ محمد زمان لواری والے۔ ص:۹۰)

"تحیر العقول فی ذاتہ" ایسا خیال ہی فضول ہے۔
اوصاف دیکھ کر دل یقین کرلیتا ہے اور طبیعت میں سکون واطمینان پیدا ہوتا ہے۔
عقل، ناقص، نااہل اور تجسس ہے، جو دشمن بن کر وسوسے پیدا کرتی ہے۔
تعوّذ کی تلوار کا اس کو ذرّہ برابر بھی خوف نہیں ہے۔
مدد پہنچ گئی۔ دشمن دفع ہوا اور مجھ پر کامیاب نہیں ہو سکا۔
اس ذات کا ورد کر جیسے گھڑیال کی آواز آتی ہے۔
بارگاہِ ایزدی میں بلا تاخیر سمجھ محتاج کی مقصد براری کرے
یارسول اللہ! اس غلام کے سر پر مہر کرم کا ہاتھ رکھیے۔"

(صدر الدین جارن، ص:۹۹)

میں بغیر کسی احتیاط کے عمیق بحر میں کود پڑا
اطراف و جوانب میں کیا دیکھوں (کیوں کہ) دوسرا کوئی بھی وسیلہ منجدھار میں نہیں
(اس لیے) اے رہنما! تیری رحمت ہی درکار ہے
یارسول اللہ! عربی الغیاث (حسین دیوڑ: ص:۱۰۰)

قسیم، نسیم، جسیم، عجب دلربا مصطفیٰ ہو گیا
آپ ﷺ کی یہ دلربائی دیکھو، ہر ایک زلفِ دوتا پر فدا ہو گیا
ظلمات کا دور ختم ہوا، محمد شمس الضحیٰ ہو گیا۔

(قادر بخش، ص:۱۱۰)

تصورات کی حد سے اوپر، گماں سے اوپر

مقامِ صاحبِ لولاک لامکاں سے اوپر

بلند اوجِ ثریا سے کہکشاں سے اوپر

جمالِ یار کی ضو ہفت آسماں سے اوپر

ان کے سامنے سیم و زر کے کیا معنیٰ

عطائے عشق محمد متاعِ جاں سے اوپر

نہ تخت و تاج پہنچ سکے نہ بخت پہنچ سکے

نصیبِ بندۂ شاہِ امم بیاں سے اوپر

(سیّد سردار علی شاہ، ص:۱۱۳)

ان مضامین میں بیشتر قدیم و جدید نعتیہ تصانیف کی فہرستیں دی گئی ہیں جو تناور نعتیہ روایت کا پتا دیتی ہیں اور ناقد و محقق کے لیے بنیادی مواد ہیں ان ذرائع سے محض قدیم اصناف سے موضوعاتی اور ہیئتی تعارف یا زبانوں کا اشتراک ہی واضح نہیں ہوتا بلکہ تحقیق و تنقید کے نئے آفاق کی طرف اشارے موجود ہیں جو فن پارے تحقیق و تنقید کے مراحل سے گزر چکے ہیں ان کا یہاں ذکر موجود ہے جو آئندہ مطالعات کے لیے رہنما ہو گا۔ اہم قدیم اور جدید شعرا کا جو کلام مرتب کیا گیا یا اُن شعرا پر لکھی گئی تحقیقی کتب و مقالات کا ذکر کس قدر سود مند ہے اس کی ایک مثال دیکھئے:

"ڈاکٹر بلوچ نے سندھی لوک ادب اسکیم کے تحت سندھی ادبی بورڈ کے توسط سے اب تک ۳۶ کتابیں شائع کروائی ہیں، جن میں "مداحوں مناجاتوں"، "معجزہ" اور "مولود" شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے ۱۸۵ شعرا کا منتخب نعتیہ کلام شامل کیا ہے۔" (ص:۷۵)

اس اطلاع میں بیک وقت علم، مطالعے، استفادے اور اضافے کی زبردست تحریک موجود ہے۔ تمام ملکی زبانوں کا ادب اس تحرّک کا طلبگار ہے۔ نیز یہاں جن اہم قدیم

مآخذ کی نشاندہی ہو رہی ہے یہ سلسلہ آگے بڑھنا چاہیے۔ ان زبانوں کی روایات پر اسلامی تہذیب کے اثرات کا جائزہ ایک اہم تحقیقی موضوع ہے اور نہ صرف ادب کا بلکہ تہذیب کا بھی اہم تقاضا ہے، اسی طرح وہ عناصر بھی قابلِ لحاظ ہیں جو خالص اسلامی تہذیب کے خدوخال ابھرنے نہیں دیتے مثلاً کامل القادری نے سوال اُٹھایا کہ:

"یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے ذکر سے بلوچی کی قدیم شاعری یکسر خالی کیوں ہے؟ کیا یہ قرامطی اثرات کا نتیجہ ہے یا محض ادباً بلوچی شعرا حضور ﷺ کا نام پاک لینے سے گریز کرتے رہے ہیں۔" (ص:۱۳۴)

سوالات اُٹھانے کی اہمیت اور تنقید و تبصرے کے تعمیری پہلوؤں سے انکار ممکن نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ لکھاری اپنے اندازِ تنقید میں ایسے جواز کو جگہ دے جو کسی بھی زبان کے ادب کے لیے صحتمند نہیں مثلاً یہ کہنا کہ:

"یہ سوال صرفِ نظر کر دینا چاہیے کہ ادبی لحاظ سے ان شعرا کی نعتیں کس معیار کی ہیں کیونکہ نعت میں رسول اکرم ﷺ سے شیفتگی اور حُب کا اظہار ہوتا ہے حبِ رسول ﷺ کا اظہار جس انداز لب و لہجے، زبان، ہیئت و آہنگ میں ہو خوب ہوتا ہے کیونکہ جذبۂ عشق کو ناپنے کا پیمانہ ادبی اوصاف نہیں ہوتے۔" (ص:۱۳۷)

اس کے بجائے مستحسن اندازِ نظر یہ ہے کہ مذہب و ادب کے اختلاط اور نعتیہ ادب کے لیے فکر و اسلوب کے ارتباط کی بات کی جائے جیسے وفا چشتی لکھتے ہیں:

"ڈھولا" سرائیکی شاعری کی ہمہ جہت اور حد درجہ مقبولِ خاص و عام صنفِ سخن ہے۔ یہ صنف جوں ہی نعت مبارک کے لمس سے آشنا ہوئی اس کے وقار گہرائی، گیرائی، اثرپذیری، مضمون آفرینی اور درد انگیز رس و نتا میں بے حد و بے حساب اضافے ہوئے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس صنفِ شعر کے اعتبارِ

ذات میں ہمہ گیریت کے ساتھ ساتھ ثبات کے کئی پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔"(ص:۲۸۱)

پاکستانی زبانوں کے نامور شعرا کی شاعری کو بحیثیت مجموعی موضوعِ گفتگو بنایا جاتا رہا ہے مگر نعتیہ امکانات کے حوالے سے نمائندہ شعرا کے کلام کا عمیق انفرادی تجزیہ بھی ضروری ہے۔ ان زبانوں کی علمی و ادبی شخصیات کو اس سلسلے میں رہبرانہ کردار ادا کرنا ہو گا۔ اذہانِ نو تک دائرۂ افہام وسیع کرنے کے لیے متصوفانہ علائم و رموز اور علاقائی علامات کا تجزیہ یقیناً موئثر ہے۔

پاکستانی زبانوں میں نعت کا یہ جائزہ بادی النظر میں جتنا معروضی معلوم ہوتا ہے فی بطنہٖ اسی قدر کیف آگیں ہے ہماری تہذیب اس احساس سے سرشار نظر آتی ہے کہ عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لہر ہر سُو موجزن ہے صبیح رحمانی نے صحیح لکھا ہے کہ:

"اس کتاب میں پاکستان میں بولی جانے والی مختلف زبانوں اور بولیوں میں نعتیہ شاعری کے آغاز و ارتقا کے مراحل کے ساتھ ساتھ ان زبانوں میں عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"(ص:۱۱)

فی زمانہ نعتیہ سرگرمیاں مادی یا دنیاوی منفعت سے متحرک ہونے کا شک سہہ رہی ہیں لیکن ابتدائے نعت کی کڑیاں جن صوفیا کے کلام سے جا ملتی ہیں، نام و نمود کی خواہش ان صوفیا کا مطمع نظر نہ تھا یہ نعتیہ روایت تمام زبانوں میں حلول کر کے ہمارے ملّی تشخص کے استحکام میں معاون ہو رہی ہے اس کتاب کا عنوان بھی مرتب کے قومی شعور کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے روزنامہ "ڈان" میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نہ صرف اسے مختلف زبانوں کے نعتیہ سرمائے کی تحقیق و تاریخ کے حوالے سے اہم قرار دیا بلکہ معاشرے کے اہم شعبہ جات میں اصطلاحات کے استعمال میں بے احتیاطی کو بھی واضح کیا، لکھتے ہیں:

> "Sabeeh has used the phrase "Pakistan Languages" and it shows that a poet and researcher of Naat can be more aware and sensitive about certain linguistic terms, than the university professors." (Oct 10, 2017)

ان زبانوں کی سطح پر نعت کی شعریات اور جمالیات مرتب کرنے کے لیے، جامع تفصیلی کام کے لیے بہرحال زبانوں اور ان کی ادبی تاریخی روایات سے کماحقہٗ واقفیت ضروری ہے۔ درحقیقت اس کتاب سے اسی اقتضا کی صراحت ہوتی ہے۔

اُردو نعت میں تجلّیاتِ سیرت

نعتیہ تالیفات کے ضمن میں صبیح رحمانی کا ذہن جن عوامل سے تحریک پاتا ہے وہ واضح ہیں۔ آفتابِ نعت کی ہر کرن ان تک پہنچتی ہے اور بحوالہ موضوع و فن وہ صنفِ نعت کی آبیاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کرنا نہیں چاہتے۔ بقول ڈاکٹر عزیز احسن:

> ''وہ نعتیہ ادب کو حوالہ جاتی سطح پر صداقت آشنا اور تخلیقی نہج پر متاثر کن دیکھنا چاہتے ہیں۔''(تاثرات: ص:۲۳)

لہٰذا نعت کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہنا ان کا شیوہ ہے کتاب کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

> ''ایسے ہی کسی لمحے میں میری توجہ نعت کے اس تبلیغی کردار کی جانب بھی مبذول ہوئی جو سیرتِ اطہر کے وسیع تر ابلاغ میں غیر محسوس طور پر کار فرما رہا ہے۔ نئی اردو نعت میں سیرتِ رسول ﷺ کی پاکیزہ جھلکیاں بہت واضح انداز میں اپنی شان دکھا رہی ہیں اور خدوخالِ سیرت کے سارے رنگوں سے اپنے معاشرے کو منوّر کر رہی ہیں۔ عصرِ حاضر کا ہر باشعور نعت گو حیاتِ نبوی ﷺ کے ایسے روشن پہلوؤں کو اپنی نعت کا سرنامہ بنا رہا ہے جو

انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر انسانی زندگی کی فوزوفلاح کے ضامن ہیں۔
عصری نعت عدل، انصاف، مساوات، انسان دوستی، اخوت اور بھائی چارے
جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پرچارک ہے جو انسانی سماج کو حسن اور توازن سے
ہمکنار کرنے میں اساسی کردار ادا کر رہی ہے۔"(ص:۱۰)

صبیح رحمانی کا یہ شعر بھی ان کے مطمعِ نظر کی تائید کر رہا ہے:

تلخ گفتار کا ماحول بدلنے کے لیے
تذکرہ آپؐ کے اخلاق کا کھُل کر لکھیں

منظوم سیرت نگاری کے علاوہ نعت میں شعرا نے سیرتِ مطہرہ کے بیشتر پہلوؤں کو جس طور بیان کیا ہے اس کا سرسری مطالعہ بھی مندرجہ بالا تجزیے کا شاہد ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے عنوان سے یہ خیال گزرتا ہے کہ نعت گو شعرا نے اسوۂ حسنہ کو اجاگر کر کے جو "شعری پیکر میں اخلاقِ کریمانہ کا محسوس خاکہ" بنا دیا ہے اس کے ادبی و فکری پہلو، مشمولہ تحاریر کا موضوع رہے ہوں گے۔ نیز سیرتِ پاک کے عملی پہلوؤں کا خوش آہنگ تذکرہ شاعر اور اس کے سماج کو باہم جس روحانی اور فکری ارتفاع سے دوچار کر سکتا ہے اس کی نشاندہی، امتیازاتِ نعت کے ضمن میں مطلوب ہو گی۔ مگر مقامِ حیرت ہے کہ مندرجہ بالا پہلو مضمون نگاروں کا اصل مرجّح نہیں رہے۔ اس کے بجائے براہِ راست سیرتِ رسول ﷺ کے فضائل بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے گویا مؤلف کا نصب العین ان تحاریر کے اجتماع کے بعد بھی تشنۂ تعبیر ہے۔

کُل چار مضمون نگاروں کی تحریریں اس کتاب کا حصہ بنی ہیں۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید کے پہلے مضمون میں ظہورِ قدسی کے پس منظر کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی آمد سے قبل دنیا تہذیب و تمدّن کی کس صورتحال میں تھی اس پر فاضل مضمون نگار نے

عمدہ اظہارِ خیال کیا ہے لیکن ''اُردو نعت کے آئینے میں'' ظہورِ قدسی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے نعت گو شعرا کے اختصاصات پر انھوں نے گفتگو نہیں فرمائی۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ شعری آہنگ کی بدولت دل پر ان ایمان افروز حقائق کی تاثیر فزوں تر ہو جاتی ہے اور اس میں نعت گو شعرا کی جس فنی اُپج کو دخل ہے وہ نعت میں تجلیاتِ سیرت کی تلاش کا ایک اہم نکتہ ہے۔ جو مضمون میں درخورِ اعتنا نہیں رہا۔ آپ ﷺ کی آمد سے قبل انسانیت کن کم سطحی معیارات سے دوچار تھی شعرا نے علائم و رموز کے سہارے، کمال ادبیت کے ساتھ اس کی تصویر کشی کی ہے۔ محاکات کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ مذکورہ مضمون سے ہی چند مثالیں دیکھیے:

کنارے ہلاکت کے دنیا کھڑی تھی
گناہوں کا انبار سر پر اُٹھائے
(محمد صادق، ص:۲۸)

کہاں تھی عارض یورپ پہ یہ سرخی بہاروں کی
خزاں تھی مہتمم ہندوستان کے لالہ زاروں کی
چراغِ رُوح ، بادِ گمرہی سے بجھنے والا تھا
بساطِ آب و گِل پہ دھیما دھیما سا اُجالا تھا
(احسان دانش، ص:۳۰)

بدلا وہ تو نے ذہن کو دل کو مزاج کو
حیرت شکستہ آئینے لائی خراج کو
(〃، ص:۳۱)

مصنف نے شعری مثالیں نہایت فیاضی سے بہم پہنچائی ہیں لیکن تاریخی حقائق کی پیشکش کو فنی تناظر میں جانچنے کی سعی نہیں کی گئی۔ مصنف نے اپنے قلم سے تاریخی معلومات کو بیان کیا ہے اور بعثت سے پہلے کا منظر نامہ دکھایا ہے لیکن پیش کردہ مثالوں میں شعرا کے بیان میں حقانیت یا تاثر کی سطح کیا ہے؟ اس پر بحث مفقود ہے۔ ظہورِ قدسی سے قبل زوالِ آدمیت اور اس کے بعد آدمیت کا عروج آشنا ہونا شعرا نے موثر ادبی پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ بعض اشعار میں اس قدر جامعیت ہے کہ یہ اشعار طویل تاریخی دستاویزات کے مطالعے کا ثمر معلوم ہوتے ہیں۔ اس بھرپور تاریخی شعور اور مذہبی آگہی کی بنیاد پر سیرت کا بیان لفظی اظہارِ محبت سے آگے کی چیز ہے یہی شعور نثر و نظم میں بیانِ سیرت کے لیے بنیادی شرط ہے۔ تاریخ کے اس مطالعے کے بعد شاعر کمالِ فن سے دریا کو کوزے میں بند کر دیتا ہے۔

وہ دن بھی تھے کہ سرابوں کا نام ساحل تھا
نہ کائنات کی آنکھیں نہ وقت کا دل تھا
(مظفر وارثی: ص:۳۹)

پروفیسر موصوف نے دوسرے مضمون میں بھی ظہورِ قدسی کو اُردو نعت کے آئینے میں صرف مثالوں کی حد تک دیکھا اور تحریر میں سراسر ذاتی احساسات کو جگہ دی۔ آپ ﷺ کے آنے سے کائنات نے جو نئی زندگی پائی اس کا بیان اس مضمون کا موضوع و مقصد نہیں اس کے بجائے یہاں ان قرائن پر بات کرنا جائز تھا کہ نعت گو شعراء نے تاریخ، تہذیب اور تمدّن پر آمدِ رسول ﷺ کی ضیا پاشیوں سے کس طرح اُردو نعت کو مستنیر کیا جبکہ پیش کردہ اشعار میں ایسے نمونے کمیاب نہیں کہ جہاں شعرا نے کہیں الفاظ و تراکیب کی مہارت سے، اجمال اور ایجاز کی صفت پیدا کی ہے اور کہیں الفاظ سے مصوّری کا کام لیا گیا ہے۔

کیف سا ایک عالم پر چھانے لگا قصرِ وہم و گماں ہو گیا منہدم
زندگی کی شکستہ نوائی رُکی مل گیا سازِ ہستی کو پھر زیروبم

آفتاب رسالتؐ ہوا جلوہ گر　　شب کی تاریکیوں نے دیا توڑ دم
پھر چمن در چمن گل مہکنے لگے　　پھر صدف ریزیاں ہو گئیں یم بہ یم

(غلام رسول عدیم، ص:۶۲)

اب آفتاب برجِ سعادت میں آ گیا　　اب ہو چکی بساطِ شبِ نامراد طے
اب دیدۂ بہار میں ہے سرمۂ غبار　　اب ہو رہی ہے بارشِ انوار پے بہ پے
اب تاجدارِ یثرب و بطحا کا ہے ظہور　　تا حدِ مصر و شام، بہ اطرافِ روم و رے

(عابد علی عابد، ص:۶۴)

پروفیسر موصوف نے تیسرے مضمون میں ''اسوۂ حسنہ'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اردو نعت کے اس تبلیغی کردار پر بات نہیں کی جس کی صراحت اس تالیف کا مطمع نظر ہے۔ نعتیہ اشعار سے دی گئی مثالوں میں اسوۂ حسنہ ﷺ کو اجاگر کرنے میں ''شعریت'' کیا کردار ادا کر رہی ہے یہ پہلو تشنۂ گفتگو ہے۔

اک ذات کہ ہے صورت و سیرت کا تفاخر
اک شخص کہ مژدہ ہے نئی آب و ہوا کا

(منصور احمد خالد، ص:۱۱۸)

تو نے وہ ثبت کیے راہِ محبت میں نقوش
سب زمانے ترا نقشِ کفِ پا دیکھتے ہیں

(حافظ لدھیانوی، ص:۱۲۲)

ایسا قیام جس سے قیامت پہ ہو یقیں　　ایسا سجود جس سے ہو مسجود کی خبر
ایسا رکوع جس سے کمانِ افق خجل　　ایسا سلام، جس کو تکے کعبہ گھوم کر

(جمشید چشتی، ص:۱۲۷)

اسوۂ حسنہ سے کیا مراد ہے، اسوۂ حسنہ کی پیروی کیوں ضروری ہے، اسوۂ حسنہ کیونکر کُل انسانیت کے لیے جامع منشور قرار پاتا ہے۔ اُردو نعت انشراحِ قلب کا یہ سامان مہیا کرنے کی کوشش میں برابر لگی ہوئی ہے۔ لیکن زیرِ نظر تحریر میں اس منصب نعت پر گفتگو کے تنقیدی تقاضوں سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔

نظیر لدھیانوی نے اُردو نعت میں سیرت کے بیان کے حوالے سے محض شعری مثالیں یکجا کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان تحریروں سے یہ فکر انگیزی نہیں جھلکتی کہ اُردو نعت بیان سیرت کے کن تقاضوں سے باخبر ہے اور کن خطوط پر ارتقا کی طالب ہے مضمون نگاروں کا کام سیرتِ پاک ﷺ کے متعلق معلومات بہم پہنچانا نہیں بلکہ نعت میں بیانِ سیرت کے لیے ایک مثالی منہج کو موضوعِ بحث بنانے کی ضرورت ہے۔

نعت میں سیرت کا بیان پیرایہ ہائے شعر کی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ بیشتر شعرا جن کا مزاجِ شعری غزل کے قرائن کا خوگر ہے انھوں نے اسی رمزیت و ایمائیت کو برقرار رکھتے ہوئے نعت کہی ہے بلاشبہ یہ انداز ادبی مزاجوں کے لیے متاثرکُن ہے لیکن اکثر اوقات غزل نما نعتیہ اشعار، اپنی انفرادی صورت میں نعت سے زیادہ غزل کا تاثر دیتے ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ رمزیت کے باوجود ہر شعر اپنی جگہ یہ قرینہ رکھتا ہو کہ اسے ہر صورت نعت کا شعر سمجھنے میں کچھ تامل نہ ہو۔ پھر سیرتِ پاک ﷺ کے بیان میں یہ بات یوں ضروری ہے کہ صریح ابلاغ کے بغیر شعر کا مقصدی پہلو تشنہ رہ جائے گا۔ جدید شعرا کے ہاں نعت میں تغزل کے قرائن کی مثالیں اس مضمون میں موجود ہیں۔

آنکھ تو اٹھتی نہیں کیا دیں جواب
ہم پہ بے پُرسش ہی رحمت کیجیے

(احمد رضا خان، ص:۸۲)

ہے لبِ عیسیٰ سے جاں بخشی نرالی ہاتھ میں
سنگریزے پاتے ہیں شیریں مقالی ہاتھ میں

(احمد رضاں خان، ص:۱۰۲)

تمہارے ہجر کے صدموں کی تاب کس کو ہے
یہ چوبِ خشک کو بھی بیقرار کرتے ہیں

(حسن رضا بریلوی، ص:۱۰۳)

اسوۂ ہجرت سے کھولی کس نے راہِ ارتقا
کس کی گردِ پا سے خطِ کہکشاں سر سبز ہے

(حفیظ الرحمٰن احسن، ص:۱۶۷)

سیرت النبی ﷺ کا بیان ہر عہد میں نعتیہ مضامین کا حصہ رہا ہے عصری میلانات اور انفرادی اسالیب اس اظہار کو تنوع بخشتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضامین میں دی گئی محدود مثالوں ہی سے یہ حقیقت واضح ہے کہ سیرتِ مطہرہ کی جامعیت اپنے بیان کے لیے چند پیمانوں کی پابند نہیں بلکہ ہر زمانے کا ادبی ماحول، مزاج، ندرت پسندی کی ہر ادا اِس نُور سے خود کو صیقل کرتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں عہد بہ عہد رجحانات کا تقابل اور تجزیہ ضروری ہے۔ سیرتِ پاک کا یہ اعجاز ہے کہ مضمون آفرینی شاعر کی بلندئ فن کے بجائے آنحضور ﷺ کی مذکورہ صفت کو دل پر نقش کیے دیتی ہے۔ اسی کمالِ تاثیر تک رسائی شعر میں سیرت بیان کرنے والے شاعر کا مطمعِ نظر ہونا چاہیے۔

پروفیسر محمد اکرم رضا نے اردو نعت کے آئینے میں "سیرتِ مصطفیٰ کی بہارِ جاوداں" کو نعت کی جامعیت میں مرکزی نکتے کے طور پر دیکھا ہے:

''چونکہ نعت خود تعریف و توصیفِ محمدؐ سے عبارت ہے اس لیے محبوب کی توصیف بطورِ خاص صورت اور سیرت کے بیان کا تقاضا کرتی ہے باقی تمام موضوعات ازخود ان دو عنوانات کی جامعیت میں سمٹ آتے ہیں۔''

(ص:۱۳۵)

بیانِ سیرت کو لازمۂ نعت تصور کرتے ہوئے انھوں نے عربی اور اُردو شاعری سے مثالیں خوب مہیا کی ہیں لیکن بیان سیرت میں اردو شعرا نے اسالیبِ نعت کو کس حلاوت سے آشنا کر دیا ہے اس کا ذکر کماحقہٗ نہیں کر پائے جبکہ مضمون میں شامل مثالوں میں ایسے چمکدار شعر جا بجا موجود ہیں۔ فنی و اسلوبی بحث سے قطعِ نظر پروفیسر محمد اکرم رضا نے نعت میں سیرتِ مصطفیٰ کی وہ کرداری اہمیت بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو اس تالیف کا مطمعِ نظر ہے۔ ان کا بیان کردہ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اس سے صرف یہ مراد نہیں کہ نعت میں جہاں لفظ ''سیرت'' آجائے وہی سیرتِ مصطفیٰ کا ترجمان ہے۔

''اس لیے ہمارے جن شعرا کی شعری تخلیقات میں لفظ سیرت نہیں ملتا مگر آپ ﷺ کے انقلاب، آپ ﷺ کی تبلیغ و اشاعتِ اسلام، آپ ﷺ کے اوصافِ حسنہ، خصائص و کمالات کی طرف اشارے ملتے ہیں بلاشبہ وہ مضامینِ سیرت ہی کی متنوع صورتیں ہیں ورنہ ایک ہی لفظ بار بار استعمال ہونے لگے تو پیغام کی جامعیت اپنے حقیقی حسن سے محروم ہو جائے اور شاید شاعر بھی صرف لفظی اور شعری یکسانیت کا شکار ہو کر رہ جائے۔''(ص:۱۵۷)

مصنف نے ہر دور میں نعت کے رجحانات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے سیرتِ رسول ﷺ کے بیان کا اصل مدّعا، اسلوبی مقتضیات اور اثر آفرینی کے لوازم کی طرف مختصر اشارے کیے ہیں حبِّ رسول ﷺ کی صداقت، مضامینِ نو کی تلاش، الفاظ و تراکیب کی

ندرت کو ضروری قرار دیا ہے۔ نیز سیرت نگاری میں کلامِ ربّانی اور احادیثِ حضور کو مدّ نظر رکھنا لازم قرار دیا ہے۔

جناب گوہر ملسیانی کے تین مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ پہلے مضمون میں مفکرینِ عالم کے تصوراتِ حسن و جمالیات کو بیان کرنے کے بعد کلامِ اقبال میں جمالیاتِ سرورِ کائنات کے مختلف زاویوں پر بھی کچھ گفتگو کی ہے مگر تمام تحریر کو پڑھتے ہوئے یہ احساس لاحق رہتا ہے کہ شاید اس تمہیدی گفتگو میں کہیں گریز کا مرحلہ آئے اور اصل موضوع شرمندۂ تفصیل ہو آپ ﷺ کے حسنِ صورت کا نعتیہ شاعری میں بیان کسی مرحلے پر بھی تجزیے سے دوچار ہوتا معلوم نہیں ہوا، ان کا قلم رہ رہ کر تنگنائے موضوع سے باہر نکلتا ہے اور حیاتِ رسول ﷺ کے واقعات کو وسعت سے بیان کرنے کی سعی کرتا ہے اس موجِ خیال کو کہیں کہیں شعری مثالوں کی بدولت توقف نصیب ہوتا ہے۔ ان کی یہ تحریر عمدہ نثر اور ترسیلِ معلومات کا اچھا نمونہ فراہم کرتی ہے مگر نعت میں عکسِ جمال مصطفیٰ کی سعیٔ امکانی کی جہات واضح نہیں کرتی۔ قاری کا ذہن الجھ الجھ جاتا ہے کہ جمالِ مصطفیٰ کے تذکار سے معنون اسی تحریر میں حیاتِ طیبہ کے مراحل، بالترتیب بیان ہو رہے ہیں اور جابجا ذاتی جذبات کے اظہار کی طوالت بلحاظ ادبی تنقید کسی بھی نقطۂ فکر پر منتج نہیں ہوتی۔ واقعات کے مسلسل بیان میں ان کی نگاہِ توجہ اصل موضوع یعنی ''نعت'' کی طرف منعطف ہوتی ہے تو وہ معرضِ تنقید سے نہیں بلکہ عالمِ سرُور سے خطاب کرتے معلوم ہوتے ہیں:

> ''شجرہائے اصنافِ سخن کی نرم و نازک کونپلوں اور ہری بھری شاخساروں پر گُل ہائے رنگا رنگ مہکتے ہیں جن میں صنفِ نعت گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے اس کی نکہت قلب و جاں معطر کرتی ہے۔ شعرائے نعت کے کلام میں جمالِ رحمت کی بوقلمونی اور طائف جیسے لہو رنگ واقعات کی ضوفشانی صنفِ نعت کو توقیر و وقار، حسن و معیار اور سخن زرنگار سے مرصّع کرتی ہے۔ یہ ذکر

جمال و نور ماضی میں خاص طور پر اور عصرِ حاضر میں عام طور پر شوکتِ شعر ہی
نہیں شوکت ایمان بھی عطا کرتا ہے۔ روحِ ارض و سماوات، مخزنِ
کائنات ﷺ کے نورانی حالات، مشکلات سے لبریز واقعات اور درخشاں
صفات و برکات صنفِ نعت کو تابانی اور فکر و خیالات کو جولانی سے نوازتے
ہیں اور شعرائے کرام کو موضوعاتِ پُر جمال کی جانب مائل کرتے ہیں ان کے
گلہائے اظہار میں نور و جمال ہے اور یوں سمجھیے کہ ہر گلِ را رنگ و بوئے
دیگر است۔" (ص:۲۱۱)

مضمون کے بعض حصوں میں نعت کے متعلق بحیثیتِ مجموعی تجزیہ اور تبصرہ بھی شامل ہے۔ نعتیہ کلام میں جمالِ مصطفیؐ کی جاذبیت کو اظہار و بیان کے شایانِ شان لوازم کے ساتھ سمو دینے کے لیے شعرا کی مساعی کو بھی سراہا ہے جو شعور، ابلاغ اور تفہیم کے عناصر لیے ہوئے ہیں۔

"اخلاق محسنِ انسانیتؐ" کے عنوان کے تحت گوہر ملسیانی نے شعرا کے کلام کو ادب و فن کی کسوٹی پر پرکھنے کے بجائے آپ ﷺ کے اخلاق فاضلہ کے عکاس واقعات و روایات پر کئی صفحے لکھ ڈالے ہیں۔ آپ ﷺ کی جود و سخاوت، صدق و راست گفتاری، محبت و شفقت، عفو و رحم، مساوات اور عدل و انصاف کے موضوع پر نعتیہ روایت میں جس طور اظہار ہو رہا ہے یا ہونا چاہیے اس حوالے سے تنقیدی گفتگو کے بجائے ان اوصاف حمیدہ پر اپنے تاثرات قلمبند کرنے کے بعد شعری مثالیں درج کر دی گئی ہیں۔

اردو نعت کے آئینے میں "رحمت و شفقتِ محسنِؐ انسانیت" کا ذکر کرتے ہوئے بھی فاضل مصنف نے زیادہ تر اپنے دلی جذبات کی عکاسی، روایات کے حوالے، اور انتخابِ اشعار ہی پر توجہ مرکوز رکھی ہے، وہ اس بات کا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ اس رحمت کے معانی کے بطن میں جھانکنے اور علمی و فکری زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے لیکن اس تناظر میں نعتیہ

کلام کا جائزہ نہیں لیتے، جناب عزیز احسن کے حوالے سے وہ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ:

> ''شاعری میں آفاقی کشش پیدا کرنے کے لیے بلحاظ موضوع شعر کو شعر بنانا ہو گا کیونکہ شاعری کا کوئی قاری یا سامع موضوع کی معلومات حاصل کرنے کے لیے شاعری کی طرف مائل نہیں ہوتا وہ تو شاعری پڑھنے اور سننے کا خوگر ہوتا ہے اسی طرح نعت کا قاری یا سامع بھی اپنے شعری ذوق کی تسکین کے لیے نعت پڑھے گا مجرد معلومات کے لیے تو وہ تاریخ و سیر کی کتب بھی دیکھ سکتا ہے۔'' (ص:۲۹۹)

لیکن موصوف نے خود اس حوالے سے نعتیہ شاعری پر تجزیاتی گفتگو نہیں فرمائی۔ تحریر میں جابجا نعت کے متعلق ایسے اشارے موجود بھی ہیں تو مرصّع اور مسجّع، شاعرانہ اسلوب کی حامل نثر میں ان تنقیدی، نکات کا تاثر دب کر رہ گیا ہے۔ تینوں مضامین میں کہیں کہیں تکرار کی صورت بھی پائی جاتی ہے جس کا سبب غالباً موضوعات کی طرف غیر معروضی رویہ ہے جو مضمون کی تنقیدی اُپج کے واضح ہونے میں حائل رہا ہے۔

گویا اس تالیف کے دیباچے میں مؤلف کا پیش کردہ ہدف ابھی تشنۂ اظہار ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں صبیح رحمانی اس کی تکمیل کا اہتمام بصورتِ دیگر ضرور کریں گے۔

”غالب اور ثنائے خواجہ“

”غالب اور ثنائے خواجہ“ بظاہر غالبیات میں ایک منفرد اضافہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ مجموعی طور پر اردو کی عظیم شعری روایت کے مطالعہ و تفہیم کے نئے زاویوں کو اجاگر کرنے کی ایک تحریک ہے جو قاری و نقاد کو ادبی تخلیقات پر بالاستیعاب غور و فکر کرنے اور بالآخر ان فکری سرچشموں کا پتہ لانے کے قابل بتاتی ہے جو شاعر کے اسالیب و لفظیات میں غیر محسوس طریقے سے جذب ہو جاتے ہیں۔ اس انجذاب کو معلوم کر لینا، ادبی روایت اور ادبی تخلیق کے بحرِ معانی میں بے تابانہ اُترنے، استقامت کے ساتھ سفر کرنے اور گوہر بدست لوٹ آنے کا عمل ہے۔ صبیح رحمانی نے بقولِ خود ”غالب کی فکر کے الہامی رشتوں کی تلاش“ کا آغاز کیا ہے اور ”نعت رنگ“ میں گوشۂ غالب میں لکھوائے گئے یہ اہم مضامین افادۂ عام کے لیے یکجا کیے ہیں۔

غالب کے نعتیہ کلام کی طرف بے توجہی کا ایک عامل یہ بھی ہے کہ اردو میں غالب کا کلام چند ایک اشعار سے زیادہ نہیں، چونکہ جدید دور فارسی آشنا نہ رہا لہٰذا اشعریاتِ غالب کے جو امتیازات فارسی شاعری سے مخصوص تھے اُردو دیوان کے مشتاقان کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ اس کتاب کا اولین مقصد و محرک غالب کی شعری عظمت کا مکرّر دعویٰ نہیں بلکہ یہ

صنفِ نعت کی ہر عہد کے ادبی، تہذیبی اور تخلیقی لاشعور میں جاگزینی کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ یہ امر صدقِ نیت پر دال ہے کہ غالب کی ناموری کے سہارے نعتیہ ادب کو اہم موضوعات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ غالب کے علاوہ فارسی میں مختصر نعتیہ سرمائے کے حامل شعرا بھی موجود ہیں لیکن ان شعرا کو یہ اختصاص دینے کے لیے اُردو میں تحقیق و تنقید کی یہ کاوش نہیں ہوئی، دراصل غالب کو فارسی نعت کے بل بوتے پر اجاگر کرنے کا محرّک اردو والوں کی ''غالب پسندی'' ہے جو اعلیٰ ذوق کی گواہ بن جاتی ہے۔

کتاب میں شامل مضامین محض تاریخ نعت گوئی میں غالب کا مقام نہیں سُجھاتے بلکہ اس کتاب کے فکری اثمار میں یہ بات بھی شامل ہے کہ غالب کے فارسی نعتیہ کلام کے سلسلے میں مذہبی عقائد و نظریات پر مبنی مباحث فکر کی پختگی، تطہیر اور اصلاح کا باعث ہیں۔ استفہام اور استدلال کی یہ فضا شعور کا جو منہج اجاگر کرتی ہے وہ بلاشبہ نعتیہ ادب کے ضمیر کو توانا کر سکتا ہے۔ مزید بر آں غالب کا نادر تخیل جن اسالیب اور تشبیہات و استعارات کو تخلیق کرتا ہے ان مضامین کے توسط سے ان کی فنی آب و تاب نکھر کر سامنے آتی ہے اور جدید نعت گو شعرا کے تخیل کی آبیاری کر کے اُردو نعت کا دامن وسیع کرنے کا بیڑہ اُٹھاتی ہے۔ یہ امر بہر طور نعت کی فنی خدمت میں شمار کیا جائے گا۔

غالب کے نعتیہ کلام میں آیات و احادیث کی ترجمانی کا بہ سند ذکر کیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نعت میں مذہبی علم کی اساسی اہمیت کو اکابر شعرا نے بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ موجودہ اور آئندہ ہر دور میں بھی یہ عنصر درخورِ اعتنا رہے گا، غالب کے کلام کے بعض ایسے نمونے بھی سامنے لائے گئے جو متداول دیوان میں موجود نہیں۔ محققینِ غالب کے لیے اس بات کی اہمیت واضح ہے۔ نیز غالب کے ذہن و فکر کے تعمیری عناصر کی روشنی میں غزلیاتِ غالب کی رمزیت واشاریت میں پوشیدہ نعتیہ عناصر

کی نشاندہی جہاں جدید تنقیدی تناظرات کی عمدہ مثال ہے، وہاں اس موضوع کے ردّ و قبول پر فکر انگیز تحاریر سامنے آئیں اور تنقیدِ نعت میں سوچ کے نئے زاویے زیبِ قرطاس ہوئے۔

نعت کے حوالے سے غالب کے فکر و فن پر مشتمل ان مضامین میں کلامِ غالب پر ایسی گفتگو بھی سامنے آئی ہے جو تنقیدی شعور اور تفہیمِ شعر کے متعلق موثر نکات سامنے لاتی ہے۔ اشعارِ غالب کے معنوی امکانات اور فنی دائرۂ کار پر بحث و تمحیص میں عمومی نکات کے علاوہ ایسے چمکتے ہوئے جاندار تنقیدی اشارے ہیں کہ ان ریزوں کو مجتمع کرنے سے کسی تخلیق کار کے لیے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ذوق کی سمت از سرِ نو متعیّن کرے اور نعتیہ ادب کے لیے افزونی کا باعث ہو۔ ناقدینِ غالب نے ان تحاریر میں غالب کے نعتیہ اشعار سے مستفیض ہونے کے لیے جس حسیت اور ذہنی و علمی سطح سے گفتگو کی ہے وہ نعتیہ شاعری اور تنقید دونوں کو معیارات عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد لکھتے ہیں:

> ''غالب کی نعتیہ شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں، الفاظ کا حسنِ انتخاب، ایجاز، رمزیت و ایمائیت دشوار پسندی، دلنشینی، تہ داری، ندرت اسلوب، حقائق نگاری، بندش کی چستی، ترتیبِ الفاظ میں موزونیت، عبارت میں متانت اور حلاوت کی لطیف آمیزش، واقعات کی سچی تصویر کشی، جاذب سامعہ موسیقی، جدت طرازی، الفاظ میں شکوہ، کلام میں پختگی، بیان میں زور، فکر میں لطافت، تخیل میں بلندی، تشبیہات و استعارات میں ندرت، الفاظ میں خلوص، اسلوب میں بداعت، صنائع بدائع کا دلکش استعمال اور حفظِ مراتب کا پاس۔۔۔ شاعر موصوف کی نعت سے کماحقہ' مستفیض و مستفید ہونے کے لیے عصری حالات، مذہبی علوم، قرآنی اور اسلامی مصطلحات، انبیائے سابقہ و دیگر صلحائے عالم کے واقعات و واردات اور پیغمبرِ مدنی کے متعلقین و متعلقات سے واقفیت اور فلسفیانہ مسائل سے روشناسی ضروری ہے۔'' (ص:۸۵،۸۶)

اس کتاب کے جو قارئین شعبۂ نعت سے منسلک ہونے کا اعزاز یا شوق رکھتے ہیں ان کے لیے مؤلف کے استحسان کا ایک زاویہ یوں بھی سامنے آتا ہے کہ ایسے قلمکاروں کا انتخاب کیا گیا جن کی تحاریر کا مطالعہ ایک سلجھے ہوئے اسلوبِ تنقید سے شناسائی فراہم کرتا ہے۔ ان مصنّفین کی بلاغت نعتیہ ادب کی تاریخ کے متعلق حقائق کشا افکار سامنے لاتی ہے اور اس عقدہ کشائی کا اعتبار بخشتی ہے کہ جدید عہد کا ناقد جانبدارانہ رویوں یا حقیقت سے اغماض برتنے والے پیمانوں پر کڑی نظر ڈال سکے نعتیہ ادب یا تنقید کو مذہبی مسالک یا سیاسی مصالحت پسندی کے غبار سے دھندلا دینا ایک ایسی قباحت ہے کہ محض آنکھیں بند کر لینے سے اس کے نقصانات سے بچنا محال ہے اس میدان میں ماضی کی اغلاط کا تدارک کر لینا بھی اتنا ہی دُور رس فائدہ دے گا جتنا لمحۂ موجود میں ہوشمند رہنا مفید ہے۔ مصنّفین نے زیرِ نظر تحریروں کے علاوہ اپنی یا دیگر مصنّفین کی ایسی تحریروں کی طرف اشارے کیے ہیں جو نعتیہ ادب اور تنقید کے وقیع مآخذ ہیں۔

مذکورہ پہلو سے مطالعۂ غالب کے توسط سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان متنوع حیثیات میں جینے اور مصروف ہونے کے باوجود اپنی ذات میں وہ حوالے اور لپک رکھتا ہے جو ایک مذہب و تہذیب سے تعلق رکھنے والوں کا اجتماعی ورثہ ہوتے ہیں۔ اس سے قطع نظر بھی کیجیے تو بھی یہ عین حقیقت ہے کہ ہر مذہب و مسالک کا پیروکار اپنی ہستی کے انتہائے شعور پر جا کر کسی طاقت کے روبرو سجدہ ریز ہونا چاہتا ہے۔ ادیب رائے پوری کے بقول:

> ”غالب، کیا صرف حسن و عشق کی داستان یا اپنی ذات پر گزرنے والی کرب پیہم کی کیفیات ہی کا نام ہے؟ اس کی مایوسیوں، مجبوریوں اور پشیمانیوں میں اس کا ذہن خالق حقیقی اور اس کے محبوب سے نسبت کو، امیدوں کو، اس کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو بڑھاتا رہا ہے، بے شک غالب نے روایت سے بغاوت کی اور یہی بغاوت تھی جس نے اسے اوروں سے ممتاز کر دیا جس پہلو

سے بھی اسے دیکھیں وہ اپنے عہد کے سخن وروں سے جدا ہے۔ الفاظ و معانی میں اس کی جدت طرازی کا مرغ بلند پرواز، دامِ روایات میں نہ آ سکا، یہی صورت اس کے مذہبی جذبات کی بھی ہے۔"(ص:۹۳)

غالبؔ کی فارسی نعت گوئی سے، اُردو نعت گوئی اسی طرح فیضاب ہو سکتی ہے جس طرح فارسی غزل سے شعرائے ریختہ نے فیض اُٹھایا، غالبؔ کی توانا تخلیقی شخصیت اس تتبع کی حقدار ہے۔ غالبؔ کے فارسی نعتیہ کلام سے جن بلیغ مثالوں پر سیر حاصل فکری و فنی بحث کی گئی۔ ان کا دائرۂ اثر خواص کے بجائے عوام تک بھی پہنچا۔ اس نہج سے مطالعۂ غالب کی ترغیب کے لیے مضمون نگاروں نے ہر ممکن سعی کی ہے۔ جس میں عمدہ نمونہ ہائے کلام کی پیش کش، تشریحی نکات کا بیان، دیگر شعرا کے نعتیہ کلام سے تقابل، ماخذاتِ کلام کی تفصیلی، نشاندہی شامل ہے۔ غالب نے نعتیہ کلام میں نبوت، خلافت، ولایت کے مناصب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے عقیدے کا منطقی اظہار کیا ہے۔ ان عقائد کی حتمیت یا صداقت سے قطع نظر، فنی نقطۂ نظر سے قابلِ غور بات یہ ہے کہ جو بھی نکات براہِ راست اظہار میں آئیں ان کی منطقی توجیہ فراہم کرنا تخلیق کار پر واجب ہے۔

لہٰذا غالب کی نعت پر جو تنقید، تنقیص کا پہلو رکھتی ہے۔ اس کے دفاع کے لیے ناقدین نے تجزیہ و تقابل کا اہتمام کیا ہے۔ یہ قارئینِ غالب، شائقین غالب اور معترضینِ غالب کو ذہنی تنظیم عطا کرتا ہوا عمل ہے یہ الگ نکتہ ہے کہ معدودے چند مقامات پر یہ موازنہ وقیع جواز نہیں رکھتا (مثلاً شفیق کے معراج نامے اور "جاوید نامہ" کا تقابل) غالب کے نعتیہ سرمائے کو بحیثیت مجموعی اجاگر کرنے کے علاوہ ایسے فن پاروں کو بالخصوص بھی موضوع بنایا گیا جو سیرت مطہرہؐ کے کسی ایک حوالے سے انفرادیت اور تخصیص رکھتے ہیں۔ جس طرح بعض تخلیقات گوشہ گمنامی میں رہ جایا کرتی ہیں بالکل اسی طرح بعض تخلیقات کے قابلِ غور

پہلو بھی تشنۂ توجہ رہ جاتے ہیں۔ نیز بعض غیر نعتیہ تخلیقات اور ان کے موضوعات کا ضمناً کسی نہ کسی پہلو سے ذکر در آتا ہے جو محققین کے لیے اضافی معلومات کا باعث بنتا ہے۔

کلامِ غالب میں فقدانِ نعت کے عوامل و اسباب کو سوچتے ہوئے ناقدین نے جس تحلیلِ نفسی سے کام لیا ہے۔ اس سے مطالعۂ غالب کے شخصی حوالوں میں منفرد اضافہ ہوا ہے۔ پھر اس تنقیدی شعور کی عکاسی بھی ممکن ہوئی ہے کہ کسی فنکار کی نعتیہ فکر کو جاننے کے لیے محض اس کے شعری سرمائے کا مطالعہ کافی نہیں بلکہ نثر و نظم کا ادغامی مطالعہ نقاد کو شاعر کی اس مکمل فکری شخصیت کا ادراک مہیا کرے گا، جو ادب پر اثر انداز ہونے کے قابل ہو۔ اس ہمہ جہتی مطالعے سے موثر نکات سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر عزیز احسن کی رائے ملاحظہ ہو:

> ”حسّاس شعرا جب تک کسی مضمون کو اپنی ذات کے اندر سمو کر شعر کا جزو بنانے کی صلاحیت حاصل نہ کریں، اس موضوع پر شعر کہنے سے اجتناب برتتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ محض بیانیہ شاعری کر سکتے ہیں جس کا عام ذہنی سطح سے بلند ہونا محال ہوتا ہے اور جو تخلیقی سطح کی وہ بلندی نہیں چھو سکتی جو اعلیٰ شاعری کا طرّۂ امتیاز ہے غالب چونکہ شاعری کا ایک بلند آدرش رکھتا تھا اور اپنے شاعرانہ خیال (Poetic perception) سے ہرگز ادھر اُدھر نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے اس نے غزلوں میں کہیں کہیں بلا ارادہ نعتیہ مضامین کی بُنت ہی کو کافی جانا، نعت کہنے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ غالب اگر اس طرح کی کوشش کرتا تو کامیاب شاعری کے مواقع کم تھے بیانیہ شاعری تو غالب سے ایک سہرے میں نہ نبھ سکی تھی۔“(ص:۱۷۰)

اس کتاب میں غالبؔ کی زمینوں میں نعت گوئی کے رجحان کو بھی موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے بلاشبہ اس رجحان سے نعت گو شعرا جس ذہنی ریاضت اور مشاقی کو بروئے کار لائے اُس سے طرفگی و تخیل کے علاوہ نعت کے لفظیات اور لسانی نظام کو بھی توانائی ہوئی۔ کیونکہ غالب

کی زمینیں بازیچہ اطفال نہیں۔ غالب کی ندرت اور جدت کی ہم پائیگی چاہنا بذاتہٖ ایک مشق طلب کام ہے۔ ان مساعی کے توسط سے اردو نعت کو فنی اور لسانیاتی توسیع نصیب ہوئی ہے۔

ان مضامین میں غالب کی نعت یا اُردو نعت سے ہٹ کر بھی ادبی تاریخ کی معلومات ضمناً تحاریر کا حصہ بنی ہیں بالخصوص غالب کی ذاتی شخصی حالت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے یہ بحثیں اس بات پر منتج ہوتی ہیں کہ نعت گو کے لیے اصلِ اصول اس کی ذات میں موجود صدق و اخلاص ہے ظاہری معمولات اس کے عقائد و نظریات کے صحیح عکاس نہیں ہو سکے۔ غالب کے خطوط اور دیباچوں سے عقائد و افکار کو جو تانا بانا سامنے آتا ہے وہ متعلقینِ نعت کو یہ تنقیدی شعور عطا کرتا ہے کہ عظمتِ پیغمبر محض ذاتی علمی اُپج یا عقیدہ و مسلک کی بات نہیں اس موضوع کو بہر طور ایک اجتماعی میزان مین تولا جائے۔

کلامِ محسن کاکوروی؛ ادبی و فکری جہات

کلامِ محسن کی ادبی و فکری جہات کا احاطہ کرتے ہوئے ان مضامین کے علاوہ مرتب نے دیباچے میں بقلم خود بھی کلامِ محسن کے تجزیے کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اُردو کی نعتیہ شاعری کی گہری معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اقلیم نعت کے بلند پایہ شعرا کے فکر و فن کی مطالعاتی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ کلامِ محسن پر ثقہ ناقدین، کی آرا سامنے آنے کے باوجود ایسے رجحانات کی کمی کو مؤلف نے محسوس کیا ہے جن کے تحت نعتیہ فن پارہ ایک تہذیبی پیداوار اور تہذیبی عامل کے طور پر دریافت ہو سکے محسن کاکوروی کی نعت میں نعتیہ مضامین سے ہٹ کر جو فنی انفرادیت اور پختگی ہے اس جوہر نے بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ مطالعۂ محسن کو نئے تناظرات دیے ہیں اور اس عمل کو آئندہ بھی وسعت درکار ہے یہ تالیف یقیناً اس سلسلے میں مہمیز کا کام دے سکتی ہے۔ یوں محسن کا کلام محض تاریخی حوالے کی چیز ہونے کے بجائے معنی خیز اور مبلغ عصریت بن کر سامنے آئے گا کیونکہ بقول صبیح رحمانی محسن کے اس بیانیے میں ہندوستانی روح اپنے جذبے اور شعور کے ساتھ اُبھرتی ہے۔

دورانِ مطالعہ یہ بات ضرور توجہ مانگتی ہے کہ اگرچہ محسن کا نعت گوئی کو بطور مستقل فن اپنانا انھیں جداگانہ حیثیت عطا کرتا ہے، لیکن محسن کی شاعری کا لکھنو کے عام طرز

شاعری سے موازنہ کرنا یا لکھنویت کے خصوصی امتیازات میں سے خارجیت، نسائیت، ابتذال وغیرہ کا تذکرہ کر کے محسن کے نعتیہ کلام کی حیثیت واضح کرنا۔۔۔ یہ نہج درست نہیں۔ اس کے بجائے محسن کی نعتیہ شاعری کا موازنہ لکھنو کی نعتیہ شاعری اور دیگر مذہبی شاعری سے کرتے ہوئے کلامِ محسن میں خلوص، صداقت، اصلیت، جوش اور صنعت گری کے خصائص سامنے لانا مناسب ہے۔ کیونکہ نعتیہ شاعری اپنے موضوعاتی دائرے تک بہر حال دیگر اصناف کے پیمانے سے ناپی نہیں جاسکتی اور کلام کی اندرونی کیفیت کو بنانے میں یقیناً سب سے زیادہ دخل موضوع کا ہے۔

محسن کی شاعری کے جس اہم وصف کو ناقدین نے یہاں نمایاں کیا وہ ان کی نعت گوئی میں جذبے، لہجے، مزاج اور عقائد کا بقدرِ جبلّت اظہار ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ نعت گو کو یہ استحقاق دینا کہ وہ اپنی اُپج کے مطابق ایک انفرادی اظہاریے کا داعی ہو سکتا ہے۔۔۔ یہ امر صنفِ نعت کے لیے کس قدر واسع اور نافع ہے۔ اس رویے کو شاعر قاری اور ناقد کے مزاج کا حصہ بنا کر نعت گوئی کو مصلحت، ریاکاری، تصنع اور آورد سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ دراصل نعت کو محض عقیدت یا جذبے کا معاملہ کہے جانے کی تکلیف بھی اسی صورت میں دور ہو گی جب ہم اس معکوس رُخ پر توجہ کریں گے کہ نعت گوئی کو کسی مذہبی، مسلکی یا علمی حیثیت سے مشروط نہ کیا جائے بلکہ ہر مطیع رسالت ﷺ بقدرِ شوق و استعداد اس صنف کو اپنانے کا اعتماد رکھتا ہو۔ یہ بات وضاحت طلب نہیں کہ بے اعتدالی سے اجتناب تو بہر حال شاعر کے تخلیقی شعور کے لیے ناگزیر ہی رہے گا۔ یہ لازمہ کسی اور شرط سے پیوست نہیں۔

حسن عسکری کے بقول:

> ”محسن کا کوروی کو زمانہ اچھا ملا۔ ممکن ہے ان کے مزاج میں ٹھٹھول اور ہنسوڑ پن کے سوا اور کچھ نہ ہو، یا انھوں نے شاعری کو محض خیال آرائی اور لفظوں

کی بازی گری تک محدود کر دیا ہو لیکن یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے عناصر ہیں اور اس اعتبار سے اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے استعمال ہونے کے لائق، ان کے معاشرے نے انھیں یہ چھوٹ دے رکھی تھی اور انھوں نے جو ہنر بھی سیکھا تھا اس کے کمالات بے جھجک دربارِ رسالت میں پیش کر سکتے تھے۔"(ص:٦٦)

اُن کے بقول "موضوع کے تقدّس" اور "بیان کی شوخی" کے اجتماعِ ضدین سے محسنؔ کی نعت میں امتیازی رنگ پیدا ہوا ہے۔ نیز ان کی شاعری کے لطف اور خلوص کی بنیاد "بے دھڑک خیال آرائی" اور "مضمون آفرینی" ہے۔ گویا نعتیہ شاعری کے لیے لفظی و معنوی سانچے متعین کرنا، نعت کی ادبی اور فطری روایت کا سدِّباب کرنا ہے۔ کلاسیکی اور معاصر ادبی سمتوں سے اپنی راہ دریافت کرنے کا انحصار بہر حال شاعر کے شعور پر ہے۔ لہٰذا کسی بھی پیرایۂ اظہار میں نعت کا طلوع و عروج ممکن ہے۔

محسنؔ کی مذہبی شاعری کا اصناف کے اعتبار سے تجزیہ اور ہر صنف میں کلام محسن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مضمون نگاروں نے ان اصناف کو عصری معیارات کے تحت دیکھا ہے اور محسن کی شاعری اُس عہد کے تمام تر موضوعاتی، لسانی، ہیئتی اور فنی معیارات کے آگے سرخرو نظر آتی ہے اور تقدیس موضوع کے باعث کم تر عناصر از خود رفع ہو گئے ہیں۔ ہندوستانی کلچر بھی محسن کی نعت کی اہم خاصیت ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"میر انیس کے مرثیوں میں حضرت امام حسینؓ اپنے طور طریقوں، ادب آداب اور طرزِ عمل سے لکھنوی دکھائی دیتے ہیں لیکن محسن کی نعتوں میں ان کا ممدوح اپنے اصلی روپ میں قرآن وحدیث کے مستند حوالوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ہندو مسلم کلچر محسن کے مزاج ان کے بیان اور فکر

میں موجود رہتا ہے۔ ان نعتوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نعتیں
صرف اور صرف "ہند مسلم کلچر" کا پروردہ ہی کہہ سکتا ہے۔"(ص:۹۲)

حُسن یہ ہے کہ بیک وقت محسنؔ کی شاعری میں ان ارضی عوامل کے ساتھ ساتھ مابعد الطبعیات بھی موجود ہے بقول جمیل جالبی اس کا مخرج و منبع اُن کا ممدوح ہے۔ ناقدین نے محسنؔ کی مثنویوں میں بھی قصیدے کا رنگ اور مزاج دیکھا ہے۔۔۔ ان تبصرات کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شاعر کا اپنا شعری مزاج اور ذہنی سطح ٹھوس حیثیت رکھتے ہیں یہ وہ سیال نہیں صنف کے سانچے کے تحت غیر ارادی طور پر ہی تبدیل ہونے لگے اس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ معیاراتِ نعت کو نبھانا نعت گو کے لیے بہر طور لازم ہے۔ اُسے صنفی استثنا کا جواز طلب نہ کرنا چاہیے کہ فلاں ہیئت میں اُس کے عدم توازن کو نظر انداز کر دیا جائے۔

محسن کی شاعری میں موضوع کے حوالے سے لائے گئے تشبیہات و استعارات، کنائے، علامتیں، سب مل کر جو فضا تشکیل دیتے ہیں اس میں ڈرامے کی طرح وحدتِ تاثر کی خوبی جنم لیتی ہے۔ یوں شعری فضا کو سحر اور جاذبیت عطا کرنا ایک رہبرانہ پہلو ہے۔ اگرچہ تعلیم یافتہ اذہان کو "محسن کی شاعری کا دائرۂ عمل" کہا گیا لیکن یہاں اسی نکتے کو دہرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو نعت کے جدید ناقدین اُٹھا رہے ہیں کہ نعت کے شاعر، قاری اور سامع کی ادبی تربیت کو نصب العین بنایا جائے نعتیہ شاعری اسلام اور پیغمبر اسلام کی دائمی اور زندہ حیثیت کی تبھی عکاس ہو گی جب قاری اور سامع کو یہ فکری عمق حاصل ہو گا کہ وہ نعت کو وقتی جذباتی تاثر کے بجائے جسمانی و روحانی کردار کی تربیت کا ذریعہ سمجھیں۔

محسنؔ کی نعت میں "شعریت" کا غالب ہونا ایک قابلِ تقلید فنی نکتہ ہے، اسے ہر نعت گو کی ذمہ داری قرار دینا بھی غلط نہیں، نعت کی ادبی جمالیات اس کا تقاضا کرتی ہے گویا محسنؔ کی نعت کے شعری خصائص کا یہ تذکرہ اس تالیف کو بھی نعتیہ ادب کی رہنمائی کا موقع

دے رہاہے ان آرا کی مجموعی اشاعت اہمیت کا یہ نکتہ رکھتی ہے کہ محسنؔ کی نعتیہ شاعری کا یہ آہنگ صنفِ نعت کو روحانی تہذیب کے مشترک اور مستقل سرچشموں سے اکتساب کرتے ہوئے ہر طرح کے سماجی سیاق وسباق میں نشوونما پانے کا اعتماد بخش رہاہے اس سے واضح ہے کہ نعت گو کی جدّت، مذہبیت کو مسخ کیے بغیر تشبیہات، استعارات، تلمیحات کا معنی افزا استعمال کرسکتی ہے۔ ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتحپوری لکھتے ہیں:

"نعت نام ہے رسولِ ﷺ اُمی و عربی کی ذات، آپ ﷺ کی صفات اور آپ ﷺ کے متعلقات ومنسلکات کے شعری بیان کا۔ اس لیے اچھی نعت کو عالم وجود میں لانے کے لیے قرآن وحدیث کا استیعابی مطالعہ لازمی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ محسن کا نعتیہ کلام قرآن پاک کی تفسیر ہے اور یہی وجہ ہے کہ محسن کی صناعی اور لفظی رعایت اور شعری تلازمات کی ساری صورتیں حدیث و قرآن کے محور پر گردش کرتی نظر آتی ہیں۔ زبان سدا سے اپنے موضوع کے تابع رہی ہے اور چوں کہ محسن کا موضوع عظیم وضخیم اور بلند وبالا ہی نہیں بلکہ اپنی پاکیزگی کے لحاظ سے نہایت ارفع واعلیٰ ہے اس لیے اس کی ادائیگی میں انھیں اسی پایہ کی زبان بھی استعمال کرنا پڑی محسن کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطلب بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں جو قرآن پاک اور حدیث شریف کے وسیع مطالعے کا ثمرہ ہے۔" (ص:۲۹۹)

تقلیدی ادب کے پس منظر میں اُبھرتی ہوئی محسن کی جدّت پسند شاعری تہذیبی تاریخ اور عصری منظر نامے سے کلیاں چنتی ہوئی اپنا الگ گلستانِ مدحت سجاتی ہے۔ محض ایک قصیدہ "مدیح خیر المرسلین" ہی اس بات کے ثبوت کا کافی ہے۔ اس قصیدے کو کئی حوالوں سے موضوعِ گفتگو بنایا گیا۔ حسن عسکری نے اس قصیدے کا ہمارے اجتماعی لاشعور اور جذباتی

کشاکش کے تناظر میں بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور محسن نے قصیدے کی فضا میں فطرت اور انسان کو جس طرح باہم پیوست کیا ہے، اس کا بہت عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس قصیدے میں موجود مقامی عناصر بھی محسنؔ کی عصری و تہذیبی حسیت کی دلیل ہیں، محسن کی شاعری میں ''اجتماعِ ضدین'' کی جس شوخی کا ذکر کیا گیا ہے اس قصیدے میں یہ اقدار ''کفر'' اور ''اسلام'' کی ہیں۔ حالی پر اُٹھائے گئے اعتراضات سے قطع نظر، حسن عسکری کے اس قصیدے پر تبصرات نعتیہ تنقید کو کیا عمدہ جہات سے آشنا کر رہے ہیں:

''یہ قصیدہ پڑھتے ہوئے محسن کی پوری شاعری کے بارے میں ایک سوال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جس کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا نعت گوئی میں محسن نے جس شوخی سے کام لیا ہے، اس میں کرشن بھگتی کی روایت کو دخل ہے یا نہیں؟ مجھے محسن کی شاعری کی کمزوریوں کا احساس ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ جذب و سرور کی شاعری نہیں بلکہ مجلس آرائی اور طباعی کی شاعری ہے، میں جانتا ہوں کہ محسن نشاطیہ رنگ میں ایسے ڈوبے کہ قیامت کے بیان اور دیدارِ خداوندی کے بیان میں سخت ناکام رہے لیکن محسن کا کلام محض کامیاب یا اچھا نہیں یہ ایک تہذیبی مظہر ہے اس سے ہمیں اپنی قوم کی اندرونی نشوونما اور اس کی سمت کا پتہ چلتا ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب کی تاریخ میں ان کا کم سے کم ایک قصیدہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(ص:۸۴،۸۵)

قصیدے کی تشبیب پر اُٹھنے والے اعتراضات کا خود محسن کاکوروی نے جو عالمانہ و مدلّل جواب دیا، یہ امر نعت گو کے ذمہ دارانہ تخلیقی شعور کی طرف ایک اشارہ ہے، کہ شاعر اپنے کہے ہوئے الفاظ کا پس منظر، پیش منظر جانتا ہے اور اپنی تخلیق کے معنیاتی سیاق و سباق کو سمجھ

کر پختہ شعور کے ساتھ فن پارے کو سامنے لا رہا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے سے محض یہ جاننا کافی نہیں کہ محسنؔ کی نعتیہ شاعری کے فکری و معنوی خصائص کیا ہیں؟ یہ جاننے کو کلیاتِ محسن کا دیباچہ بھی شافی ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ محسن کے فنِ شعری کو نادر بنانے میں جو بھی تکنیک معاون ہوئی ہے، اکتسابِ فن کے لیے اس پر غور کیا جائے مثلاً بادل کا قافیہ، قصیدے میں شامل غزلیات میں ردیف بن کر آتا ہے لیکن شعری فضا کے عناصر وہی رہتے ہیں۔ اسی طرح قصیدہ جس مصرعے سے شروع ہوتا ہے اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ”یہ ایک ایسی تکنیک ہے کہ آج تک کسی قصیدے یا کسی دوسرے صنفِ سخن میں میری نظر سے نہیں گزری یہ افسانہ گوئی کی وہ تکنیک ہے جسے غلام عباس نے اپنے افسانے ”آنندی“ میں اور ضمیر الدین احمد نے ”سوکھے ساون“ میں کمال چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔ جب کہانی ختم ہوتی ہے تو وہیں سے پھر شروع ہو جاتی ہے یہی صورت اس قصیدۂ لامیہ کی ہے کہ جب یہ ختم ہوتا ہے تو وہیں سے پھر شروع ہو جاتا ہے یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مدحِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ختم نہ ہونے والی شے ہے یہ یوں ہی ابد تک جاری رہے گی۔“ (ص:۱۰۷)

کہا جاتا ہے کہ محسنؔ کا رنگِ شاعری رجحان کی صورت اختیار نہ کر سکا لیکن یہ بات حتماً نہیں کہی جا سکتی کہ یہ امکان اُس دور کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کلامِ محسنؔ کے موثر اور دلنشیں زاویوں کے نمایاں کرنے سے، اس دور کو زندہ کرنا یا اس رجحان کی خواہش کرنا ضرور ممکن ہے امتدادِ زمانہ کے ساتھ تمام سماجی شعبے پلٹا لینے کی کیفیت سے دوچار نظر آتے ہیں۔ اب معیارات کے تیزی سے گرنے یا بننے کا عہد ہے ایسے میں کچھ عجب نہیں کہ نگاہِ شاعر کو یہ فن

کی بیک وقت سنجیدہ، متین اور شوخ روایت اس قدر بھائے کہ وہ اسے معیار بنانے کے لیے کسی نام نہاد سطحی روش کو خیر باد کہہ دے۔

پھر اس قصیدے میں ہند اسلامی تہذیب کی باکمال صورت گری نعت گو شاعر کو یہ حوصلہ بخش رہی ہے کہ اس کا تخیل ہمہ اطراف سے نمو پاتی ہوئی شعور کی گوناگوں لہروں کو ایک ابدی موضوع میں ضم کر دے۔ مگر یہ بات ضرور ملحوظ رہے کہ افہام کا دائرہ قدرے شفاف ہو ورنہ تمام تر شعور و اکتساب کے باوصف شاعر کا کلام اسی کم اعتنائی کی نذر نہ ہو جائے جو کلامِ محسن کا مقدر ہوئی فن کی کسی بھی لو کو ظلمتِ حال میں کیونکر بڑھائے رکھنا ہے، یہ عقدہ نعت گو شاعر کو خود حل کرنا ہے۔ ڈاکٹر شجاعت سندیلوی لکھتے ہیں:

> ”محسن نے بڑا کام کیا کہ مذہبی و نیم مذہبی امور کو قصیدے میں جگہ دے کر نہ صرف وسیع النظری کا ثبوت دیا بلکہ ادب کو ایک نئے میدان کی طرف بڑھانے کی کوشش کی۔۔۔ ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے کی فکر نے ایک نئے عنوان کا اضافہ کیا۔ قصیدے کو بھی دلچسپ بنایا اور ادب کے بڑے فرض کو ادا کرنے کی کوشش کی۔“(ص:۱۹۳)

اس نہج پر غور کرتے جایئے تو خیال گزرتا ہے کہ ادب کو زندگی سے قریب کرنے کا عمل انتخابِ صنف سے مشروط نہیں۔ اب بھی ضروری ہے کہ بعض اصنافِ شعری (جن میں سے ایک قصیدہ ہے) کے کم استعمال کے اسباب پر نظر ڈالی جائے۔۔۔ اور دیکھا جائے کہ کیا اس بے دھیانی کو محض ”وقت کے ساتھ بدلتی دلچسپیاں“ یا مشینی اور صنعتی ترقی کا نتیجہ قرار دینا صحیح ہے؟ یا شعرا کی کم علمی یا تساہل پسندی بھی اس ذہنی ریاضت میں مانع ہو سکتی ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ کسی ادبی رجحان، رویے یا صنف کے قبول یا رڈ کا عمل یک طرفہ نہیں، نہ یہ ایک فرمائشی عمل ہی ہے کہ قاری خود شاعر یا ادیب کی نہج متعین کرے، جو رنگ اور جو معنیاتی

نظامِ تخلیق کاروں کی جانب سے پیہم اور باتاثیر روشناس کرایا جائے گا وہ لازماً دلچسپی اور قبولیت کاردِ عمل بھی حاصل کرے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان تحریروں کی یکجائی سے مرتب کا اصل مدعا سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

بعض اوقات نعت گو شاعر کا ''جدّت کا شوق'' طرح طرح کی دِقّتیں قاری اور ناقد پر لاتا ہے۔ منفرد لفظیات کے ذریعے شاعر کی ''مضمون آفرینی'' کی کوشش اگر بے سروپا ہو تو یہ بھی ایک ایسا ہی عامل ہے جس کے تحت تنقید کو خواہی نہ خواہی ادب اور مذہب کے الگ خانے بنانا پڑتے ہیں اس کارِ مبہم میں نقصان صنفِ نعت کے سوا کسی کا نہیں جبکہ محسن کاکوروی کا کلام ہوشمندانہ جدّت کی عمدہ مثال ہے ان کی شعری فضا میں لایا گیا ہر لفظ اپنا جواز رکھتا ہے۔ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط لکھتے ہیں:

> ''تہذیب، ثقافت اور مذہبی امور کی حامل یہ روایتیں جس طرح مختلف زبانوں کے ادب کو متاثر کرتی ہیں اسی طرح ان زبانوں کی بعض اصطلاحات بھی اپنی مخصوص معنویت کی بدولت دیگر زبانوں کو متاثر کرتی ہیں۔ بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ دوسری زبان کے کسی ادب پارے کے متن کی معنوی شدّت کو بڑھانے میں زبردست معاونت کرتی ہیں۔ ادبا و شعرا اگر ان اصطلاحات کی معنویت سے صحیح طور واقف ہوں تو ان کے برجستہ استعمال سے اپنے کلام میں نکھار پیدا کر سکتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ محسن نے اصطلاحات کی انہی معنوی باریکیوں کا خیال رکھ کر انھیں اپنے قصیدے ''مدیح خیر المرسلین'' میں استعمال کیا ہے۔''(ص:۲۲۷،۲۲۶)

ڈاکٹر مولا بخش نے اس قصیدے میں بادل کو ایک استعارہ اور ایک ساختیہ قرار دیا ہے جو ماحولیات کا عکاس اور تہذیبوں میں مذہبی و لسانی انسلاکات کا شارح ہے، اسی بنیاد پر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ قصیدہ آنحضرت ﷺ سے عشق کا انوکھا منظر سامنے لاتا ہے اور ساتھ ہی ہماری سر زمین ہند میں داخلے سے لے کر تاحال کی تہذیبی نیرنگی، اخذ و قبول اور ثقافتی اضافیت نیز ثقافتی تاخر (Cultural Log) کا نقشہ بھی مرتب کرتا ہے۔''(ص:۳۳۰)

اس قصیدے پر ناقدین اور محققین کی خامہ فرسائی کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ محسن کا فن محض اسی قصیدے سے واضح ہے محسن نعتیہ کلام میں مثنوی نگاری کے اصولوں سے بھی کماحقہٗ عہدہ برآ ہوئے ہیں ان کا کلامِ نعتیہ موضوعات، لفظیات اور معنیات کا خزینہ ہے۔ محسن نے تشبیہات و استعارات، تلمیحی تلازمات حسنِ تضاد، مترادفات، نادر الفاظ تراکیب صنائع بدائع، صوتی تکرار، رعایت لفظی و معنوی، نظامِ قوافی اور لہجے کے تنوع سے نعتیہ شاعری میں اپنا غیر متزلزل تشخّص قائم کیا ہے۔ صرف محسن کا اسلوب ہی ان کے فن کی دلیل نہیں۔ نعتیہ روایت کے کم و بیش سبھی موضوعات پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں سراپائے رسول ﷺ، معجزاتِ رسول ﷺ، اخلاقِ رسول ﷺ۔۔۔ سب عناصر مجتمع ہیں اور ان موضوعات سے وہ کس خوبی سے سرخرو ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر تحاریر اس کی شاہد ہیں۔

ناقدین نے محض روایتی تحقیق سے کام نہیں لیا بلکہ ایسے منفرد نکات سامنے لائے ہیں۔ جو نعت پر تنقید کو ایک کشادہ ماحول میسر کرتے ہیں کاشف عرفان نے محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری میں الگ فکری و فنی سطح، برصغیر کی ہندلمائی تہذیب کے عناصر، زبان کے بطور

ایک نامیاتی اکائی استعمال، زبانوں کے اختلاط کی کوشش، انسان دوستی کی ترغیب اور بین المذاہب ہم آہنگی کی کوشش کے حوالے سے چند اہم سوال اُٹھائے ہیں بلاشبہ یہ سوال اور ان سے منسلک بے شمار سوالات کا اطلاق محض محسن کاکوروی پر نہیں ہر عہد کے نمائندگانِ نعت پر ہوتا ہے۔ انھوں نے محسن سے پیشتر اورمحسن کے بعد کی نعتیہ روایت کے تلازمات کو دریافت کرنے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

الغرض کلامِ محسن کے مطالعات نے نعتیہ تنقید کو اہم تر موضوعات سے نوازا ہے۔ کلامِ محسن کا بیشتر ادبی، تہذیبی، ثقافتی، لسانی اور اسلوبیاتی تناظرات میں جائزہ لیا گیا۔ خصوصاً حسن عسکری کی تحریر نے جہاں کئی سوالوں کے جواب دیے وہاں بہت سے نئے سوالوں کو بھی جنم دیا یوں اس سلسلۂ بحث نے جابجا تنقید، تحقیق، تفہیم، تفحیص، توثیق اور تردید کے گلہائے رنگ رنگ سجا دیے ہیں۔ رنگ و خوشبو اور حُسن و خوبی کے ان استعاروں سے استفادے کو صبیح رحمانی کی اس تالیف نے قدرے آسان اور ممکن کر دیا ہے۔

کلامِ رضا: فکری و فنی زاویے

مذہب و ادب میں تفاوت کا مفروضہ جن اصنافِ ادب کو بلیغ نقد و نظر سے محروم رکھ سکتا ہے۔ ان میں حمد و نعت مقدّم ہیں، مولانا احمد رضا خان کی علمیت کو ان کی ادبی شان کے لیے حجاب نہ ٹھہرنا چاہیے بلکہ ان کا عالمِ دین ہونا، ان کے شعری معیار کو کیونکر تقویت دے رہا ہے۔ اس پہلو کو اجاگر کرنا ضروری امر ہے اس میں شک نہیں کہ مولانا کی نعت گوئی کے اثرات نقد و نظر کے واسطوں سے مستثنیٰ ہو کر روایت میں سرایت کرتے رہے تھے لیکن جناب صبیح رحمانی کی یہ خصوصی کاوش ان کہے، غیر محسوس رویوں کو باقاعدہ تحریک دینے کا عزم و عمل ہے۔ انھوں نے کلامِ رضا کے اہم فکری و فنی اور لسانی حوالوں کے معاصر ادبی مباحث اور تجزیاتی مطالعات میں نظر انداز کیے جانے کو ہماری تنقید کے آگے ایک بڑا سوالیہ نشان قرار دیا ہے یہ لازم نہیں کہ اہلِ نقد و ادب کی یہ غفلت دانستہ یا متعصبانہ رہی ہو۔۔۔ بلکہ ایک اہم عامل یہ رہا ہے کہ ان کے کلام میں علومِ قرآن و حدیث کے حوالے، تشریح و تنقید کے لیے بھی اسی آگہی کے متقاضی ہیں۔ یہ گنجائش بہر حال ضروری تھی کہ علوم اسلامیہ پر عبور نہ ہونے کے باوجود ان کی (بلکہ ہر عالم کی) شاعری کا ادبی محاسبہ روا رکھا جائے، دراصل مولانا کی شاعری اور ان کے فن پر تنقید کی سمت اہلِ علم کو متوجہ کرنا اور سوچ کے زاویوں کو مرکز و محور مہیا کرنا ہی وہ اقدام تھا جس کی ابتدا صبیح رحمانی کی اس تالیف سے ہوئی ہے۔ ابتدا میں لکھتے ہیں:

"نقد و نظر کا ماحول ایک کھُلی فضا کا تقاضا کرتا ہے جبکہ ہم نے مولانا کے گرد ایسا تقدیسی ہالہ قائم کر رکھا ہے جو شعری تخلیقات کو معروضی انداز اور ادبی معیارات کی روشنی میں پرکھنے والے سنجیدہ اہل قلم کو اس طرف آنے سے روکنے کا سبب بن رہا ہے۔" (ص:۹)

زیرِ نظر تحاریر میں بھی جابجا یہ تاثر ملتا ہے کہ مولانا کے کلام پر ادبی تنقید بروئے کار لاتے ہوئے ان کا دینی تفضّل پل بھر کو نظر انداز نہیں ہوا۔ گویا فن اور ناقد کے مابین ان کی شخصیت کو اس جاہ سے ایستادہ کر دیا گیا کہ ناقد شعر کو نظر بھر کر نہ دیکھ سکے یہ تالیف اسی سمت ایک سعی کار آمد ہے کہ "اس ایوان میں فکر تازہ کے دریچے" کھُلیں اور کلامِ رضا کی تفہیم شعری تنقید کے توسط سے ایک خالص ادبی حوالہ بن کر سامنے آئے، خود مؤلف کے پیش کردہ معروضات اس ضمن میں خاطر خواہ سمت نمائی کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان نکات کو مولانا احمد رضا خان پر تنقید و تفہیم کے لیے کیے گئے اقدامات میں آئندہ بھی مدّ نظر رکھا گیا۔

مولانا کے کلام میں حمد و نعت کی ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے۔ مناقب سے معنون شاعری بھی نہ صرف مشرقی تنقید کے قدیم معیارات پر پورا اترتی دکھائی دیتی ہے بلکہ اس میں موجود تلمیحی اشارے اسلام کے نورِ ہدایت کا ابدی تسلسل اجاگر کر رہے ہیں اہل بیت اور صحابہ کرام کی مدح کا اوّلین محرّک ان ہستیوں کا محبوبِ خدا سے منسوب ہونا ہی ہے۔ ان کے تمام شعری سرمائے کو موضوع، فکر، زبان و بیان اور صنائع بدائع کے ساتھ ساتھ عقائد کے حوالے سے بھی موضوع تنقید بنایا گیا ہے۔ مگر یہ احتمال بہر حال مدّ نظر رہنا چاہیے کہ شاعر کے صحت عقائد کی بحث غیر متوازن ہو تو ادبی تنقید کو بے سمت کر سکتی ہے۔

مولانا احمد رضا خان کے تبحرِ علمی نے ان کی اُردو شاعری کو قرآنی آیات و احادیث سے مملو ایک تلمیحاتی فضا عطا کی ہے اس فضا میں وہ ان صنائع کی بدولت بھی سرخرو ہوئے ہیں جن کا استعمال قدرے علمیت و ریاضت کا متقاضی ہے۔ ان کے ہاں ملمع اور مرصّع کلام کے علاوہ محاورات، استعارات، صنعت اتصال تربیعی، صنعت سوال و جواب، تجنیسِ مماثل،

تجنیس مستوفی تجنیس زائد وغیرہ کی بکثرت مثالیں یہ واضح کر رہی ہیں کہ مولانا کے کلام پر تنقید کا بیڑہ اُٹھانا ایک بھاری ذمہ داری ہے یہ دور تساہل پسندی اور کم علمی کی ستر پوشی کرتی ہوئی شہرت کا ہے ایسے میں صاحبِ علم شاعر پر تنقید کو نظر انداز کیے جانے کے کئی وجوہ ممکن ہیں جن کی اجتماعی ماحول میں کھوج یا نشاندہی مروّجہ ادبی تہذیب کے خلاف ہے۔

علامہ شمس بریلوی نے اپنے مضمون میں دورِ حاضر کے علمی افلاس اور شعرا کا علمِ بیان، علم قافیہ اور فصاحت و بلاغت کے لوازم و قواعد سے بے اعتنائی کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

''جناب رضا قدس سرہٗ کا تعلق اس دور سے تھا جب فن عروض و بلاغت کو شاعری کی جان سمجھا جاتا تھا۔ علم معانی و بیان پر بیسیوں کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ قطعہ و رباعی میں فرق سمجھا جاتا تھا۔ تشبیب و گریز کا مفہوم ہر شاعر جانتا تھا۔ علمِ قافیہ کے آداب شاعری میں ملحوظ رہتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں مطلع میں ایطاء پیدا نہ ہو جائے غزل کے قوافی عیبِ قافیہ کی زد میں نہ آجائیں کوئی مصرع بحر سے گر نہ جائے اور آج تو سریلے سازوں کی نواؤں اور مغنیوں کی صداؤں میں نثر بھی نظم کا روپ دھار لیتی ہے تو ان قیود و آداب اور فنی بندشوں کے عذاب میں خود کو کون ڈالے۔''(ص:۹۰)

مولانا کے کلام میں صنائع معنوی مثلاً ایہام، طلب، توریہ، عکس، رجوع، جمع، تفریق، تقسیم، تجرید، مذہب، کلامی، اشتباع، توجیہ، تجاہلِ عارفانہ وغیرہ کا ذکر ناقدین نے کیا ہے لیکن اس کے باوصف ان کی شاعری یہ قوت رکھتی ہے کہ وفورِ عشق اور جذب و صداقت نے ان کی نعت کو ہر ذہنی و علمی سطح کے لیے مقبول بنا دیا ہے۔ فن اور اسلوبیات کے مباحث سے قطع نظر ان کا شعر کیفیات کی ترسیل اور قاری کی اس کیفیت میں شمولیت اور سرشاری کی بھرپور قوت اپنے اندر رکھتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اس کلام کو اپنے سرہانے رکھیے اور روز ایک آدھ نعت دھیرے دھیرے اس کی کیفیات کو اپنے باطن میں سموتے ہوئے پڑھیے تو آپ رفتہ رفتہ محسوس

کریں گے کہ حضرت کا کلام ہی نہیں بلکہ خود حضرت آپ سے کلام کر رہے ہیں اور روحِ عشقِ مصطفیٰ ﷺ آپ کے اندر جلوہ گر ہو رہی ہے۔"(ص:٦٦)

جذبۂ عشق رسول ﷺ کا وفور ہی ان کے کلام کے ہر زاویے کو دلآویز اور دلکش بنا رہا ہے اس لطافت میں بھی بلند آہنگی ان کے تبحرِ علمی اور عصری معیاراتِ شعر کے باعث ہے۔ مگر مولانا کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے فنِ شعر کے یہ لوازم نعت میں کیونکر استعمال کیے۔ یہ جائزہ یقیناً عام شعری تجزیے سے مختلف ہے ناقدین نے ان عالمانہ تجزیات کے ساتھ بہترین انتخابِ شعر بھی میسر کر دیا ہے اور نعتیہ تنقید میں اس پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ شریعت کی پاسداری کے بغیر نعت گو کی قوتِ متخیّلہ راہ داں نہ ہو سکے گی۔

سلامِ رضا کی مقبولیت عام نے مولانا کے تمام کلام پر سبقت لے لی ہے۔ ہر چند کہ اس قبولیت کی بنیاد خلوص و وابستگی پر ہے لیکن اس کے محاسنِ کلام کو بھی ثانوی حیثیت دینا مشکل ہے۔ نبوت و رسالت کے مختلف پہلو اور معجزاتِ نبیؐ کا تذکرہ، دقیق نکتوں کی حامل لطیف شاعری بیک وقت عالمانہ شان اور عاشقانہ سرمستی لیے ہوئے ہے۔ بقول ڈاکٹر ابوالخیر کشفی:

"ان اشعار کے جسم میں آیاتِ قرآنی کے مفاہیم اور کنایے روح کی طرح دوڑ رہے ہیں۔"(ص:١٠٩)

حضور ﷺ کے اخلاق و عادات و اطوار اور سراپائے محبوبِ خدا سبھی کا ذکر نوبہ نو تراکیب میں جامعیت سے سمٹ آیا ہے۔ ڈاکٹر اسحاق قریشی قصیدۂ سلامیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"ایک بھرپور تاثر کا حامل قصیدہ جس میں ذات سے صفات تک، خصائص و شمائل سے امتیازاتِ سیرت تک، مدح سے دعا تک، وجودِ پاک سے متعلقاتِ وجود تک ایک رحمت کا سائبان تنا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس قدر طویل تاثر کو یکتائی کا اسیر رکھنا صاحبِ فن کا ہی کمال ہے۔ ایسا صاحبِ فن جو لفظوں کی حُرمت سے بھی آشنا ہے اور معانی کے تقدس سے بھی آگاہ ہے۔ یہ بلاشبہ

شعری عظمت کی معراج ہے۔"(ص:۱۴۱)

برصغیر کے دورِ غلامی کے پس منظر میں ڈاکٹر اسحاق قریشی نے مولانا کی علمی جہات اور تخلیقی رویے کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ تاریخی تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ بقول جانسن کسی تخلیق کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں خود کو اس عہد میں سانس لیتا ہوا محسوس کرنا ہو گا، فاضل مضمون نگار نے اسی انداز سے مولانا کے معاصر ادبی ماحول، تقاضوں اور فنی لوازم کا جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی مولانا کے علمی و فقہی شعور اور ان کی ذاتی شخصیت کے تناظر میں ان کے شعری مزاج کا تجزیہ کیا ہے۔ اپنے ممدوح کے خصائص، خصائل، شمائل، جود و کرم کے تذکرے کے ساتھ استغاثہ و استعانت میں بھی مولانا کے خلوصِ سیرت نگاری کو اجاگر کیا ہے۔ معجزات کے ذکر میں ان کی نادر تراکیب اور منفرد قوافی و ردیف نے چار چاند لگائے ہیں۔ بالخصوص قصیدۂ معراجیہ میں معراج کا بیان بے مثال ہے۔ ڈاکٹر اسحاق قریشی لکھتے ہیں:

"ایک واقعہ واردات کی صورت، لفظ و معنی کو محیط ہو گیا ہے رواں دواں بحر دل پر دستک دیتے مرکبات اور مشکل تر موضوع کو دل نشیں کر دینے والا اسلوب۔۔۔"(ص:۱۳۸)

انھوں نے مولانا کے سرمایۂ شعر و نثر سے یہ حقیقت بھی اخذ کر لی ہے کہ معتمد عالم اور مستند محقق ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا اعلیٰ تنقیدی بصیرت سے بھی متّصف تھے۔

جناب احمد جاوید نے کلامِ رضا میں حسنِ اظہار کا وسیلہ بننے والے لوازمات اور تصورات کو جمالیاتی زاویوں سے دیکھا ہے اور اس اہم نکتے پر بحث کی ہے کہ مولانا احمد رضا خان صاحب کی شخصیت کا جوہر ان کے فتاویٰ میں نہیں "حدائقِ بخشش" میں ہے۔ جس میں مولانا نے محبت و معرفت کے تقاضے اس طور نبھائے ہیں کہ عشقِ رسول ﷺ کے والہانہ احساس و اظہار کو خواص و عوام کے دلوں میں زندہ کر دیا۔ مولانا کی نعتیہ شاعری عظمتِ رسالت کا جو ذوق رکھتی تھی اس کے طفیل ہمارے عشقِ رسول ﷺ کے فطری جوہر کو جِلا ملی ہے۔ احمد جاوید کے بقول:

"اعلیٰ حضرت کی یہ شانِ عشق ان کی شانِ علم کی کمک پر ہے۔" (ص:۱۵۲)

انھوں نے مولانا کے کلام میں موجود شدتِ اثر کو متصوفانہ زاویوں سے دیکھا ہے اور وہ نکات بیان کیے ہیں جو نعت کے فکر و فن میں بہر صورت دخیل ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ذاتِ اکمل کو Symbolization کی حاجت نہیں بلکہ بڑا شاعر اپنی ذات کو سمبلائز کرتا ہے:

"رسول اللہ ﷺ کے بارے میں حدائق بخشش سے حاصل ہونے والی معرفت کیا ہے۔ یہ اتنا قیمتی نکتہ ہے کہ اگر حدائق بخشش ظہور میں نہ آتی تو اُردو خواں حضرات کی تحویل سے ہمیشہ کے لیے باہر رہتی وہ نکتہ ہے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی میں اصالت (Principality) اصل کی حیثیت آپ ﷺ کی حبیبیت کو حاصل ہے۔ آپ ﷺ اپنے جوہرِ ہستی میں حبیب اللہ ہیں۔ اپنی ہستی کی فضیلت میں رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کی رسالت آپ ﷺ کی **حبیبیت** کی Menifestation ہے۔ آپ ﷺ کی **حبیبیت** اصل ہے۔۔۔ اگر آپ صرف اس پر فوکس کر کے اب حدائق بخشش کو دیکھیں تو آپ کو اس میں موجود تمام معانی میں ایک نیا کرنٹ دوڑتا ہوا نظر آئے گا ایک نیا ربط پیدا ہوتا دکھائی دے گا اور آپ کو رسول اللہ ﷺ کی وہ معرفت حاصل ہو گی جو کسی دستیاب ذریعے سے ممکن نہیں ہے۔" (ص:۱۵۵،۱۵۴)

کلامِ رضا میں تازہ کاری کے امکانات کی تلاش پر ڈاکٹر ریاض مجید نے اظہارِ خیال کیا ہے اور روایتی و تقلیدی استفادے کے بجائے تخلیقی استفادے پر زور دیا ہے بلکہ سرِ دست حدائقِ بخشش کی معروف نعتوں کے مصرع ہائے اولیٰ سے کئی نعتیہ زمینیں اخذ کرنے کے کچھ تجربے بھی کیے ہیں اور ان سے نعت نگاروں کو استفادے کی دعوت دی ہے۔

کلام رضا کی منفرد ردیفوں نے معنی کو نئی جہات دینے کے علاوہ بجائے خود

موضوع کی صورت بھی اختیار کر لی ہے جو بسا اوقات بقول عبد النعیم عزیزی نعت کو ایک مکمل تجربے میں بدل دیتی ہے۔ فن کے یہ مباحث نعتیہ ادب کے لیے جاں بخشش ہیں۔ مولانا احمد رضاں خان کی نعت میں خصوصاً دفاعِ رسول ﷺ کے حوالے سے جو مدلّل اور مستحکم انداز ہے۔ اس کی بنیاد علمِ دین پر ہے۔ اس تجزیے کے علاوہ ان کے شعری تناظر کو سیاسی سیاق و سباق اور عنادین اسلام کی فریب کاریوں کے تناظر میں بھی پرکھا گیا ہے۔ یہ جائزہ واضح کرتا ہے کہ بڑا فنکار ہر صنفِ ادب کو اپنے تہذیب و تشخص کا آئینہ دار بنا دیتا ہے۔ بعض جگہوں پر ناقدین کا اسلوب تنقید یا فن شناسی کے بجائے عقیدت مندی کے تقاضے نبھاتا ہے لیکن ان باتوں سے قطع نظر ان تحریروں کا ماحصل یہی ہے کہ اس قدر زمانی بعد کے باوجود مولانا کی شاعری قدیم و جدید معیاراتِ فن سے قریں ہے یہ آفاقی شاعری کی خصوصیت ہے۔

کلامِ رضا میں صنعتِ مجوب کے مسائل کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ہیئت اور تعیینِ بحور کے معاملے پر بات کی گئی ہے جس کی بنیاد پر آغازِ مباحث ممکن ہے لیکن فی زمانہ یہ تردّد مفقود ہے۔ صاحبانِ علم کو اس کا بیڑہ اُٹھانا چاہیے۔ لسانی لطافت اور ندرت کی یہ ترجمانی بھی ضروری ہے۔ فنکار کی مانند، قارئین میں بھی مشکل پسند طبائع فطرتاً ہی ودیعت ہوتی ہیں۔ ان کا سامانِ ذوق بھی کوئی تو مہیا کرے گا۔۔۔ جو شخص صاحبِ علم ہے۔ یہ خوبیاں اس کے ہاں بے ساختہ ہی در آتی ہیں کوئی کم مایہ زبردستی اس پر مشق کرے گا تو تصنّع کا گماں ہو گا۔ ایسی جداگانہ خوبیوں کو ہرگز ابلاغ یا دائرۂ قبولیت میں حائل نہ سمجھنا چاہیے ایک ممتاز ہنرور کے خواص میں مقبول ہونے کا حق قائم ہے۔ محض عوامی مقبولیت حتمی معیار نہیں یہ معاملہ تو ذوق و آگہی کا ہے۔

اسی طرح عربی، فارسی، اردو، ہندی، ترکی زبانوں کے علاوہ مقامی زبانوں سے رسمی تعارف کبھی کبھی چونکانے کا کام کر سکتا ہے مگر ان پر ماہرانہ قدرت یقیناً ابلاغ کی عالمانہ قوت رکھتی ہے جسے سراہنا بھی ذوقِ بلند کے بغیر ممکن نہیں۔ مولانا احمد رضا خان نے منفرد، کم مستعمل اور بظاہر غریب و متروک الفاظ کو اپنی تخلیقی قوت سے حرکت و توانائی عطا کی ہے۔ ڈاکٹر تنظیم الفردوس لکھتی ہیں:

"ان کی شاعری میں کوئی جز ماورائے شاعری بھی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس جز کا تعلق ان کے علمی مرتبے، فضل و کمال یا کسی بھی نوع کی ہمہ دانی سے نہیں ہے اس کے باوجود ان کے کلام میں لفظی دروبست اور صوتی و لسانی ہمہ رنگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کا انفرادیت کا رنگ بخوبی ابھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔"(ص:۲۰۴)

دیہی اور مضافاتی بولیوں، علاقائی محاوروں، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ اور کہاوتوں اور علامتوں سے ان کی واقفیت عربی زبان اور اسلامی فضا سے مل کر عجب رنگ دکھاتی ہے۔ عقائد کی ماورائیت بیان کی ارضیت میں ضم ہے۔ حرف اور محاورے کے مزاج کو سمجھنا اسے سامع کی نفسیات کے لیے مقبول ترین صورت دینا فنی کامیابی ہے۔ لفظیات کے ضمن میں وقیع مطالعاتِ رضا کی راہ ہموار کرنا ضروری ہے۔

فنی و لسانی حوالے سے کلامِ رضا کے سلسلے میں اٹھائے جانے والے مباحث، سوالات اور ان کی جوابی توضیح، فکری تحرّک اور سرگرمی کا باعث ہے۔ ضرورت میدانِ ادب میں ان علوم کے احیا کی ہے۔ یہ ادبی تہذیب کا ہم پر قرض ہے اسے کسی کو تو اپنے ذمے لینا ہے ورنہ یہ غلط فہمی پنپتی رہے گی کہ یہ خصوصیات اور ہنروری صرف خالص مذہبی عالم ہونے سے مشروط ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ادب کی تخلیق و تنقید کا دائرہ سمٹنے کے بجائے بڑھ کر تہذیب کے مستحکم اور وقیع سرچشموں سے جا ملے۔ مضمون نگاروں نے کلامِ اساتذہ سے استناد کرتے ہوئے جو تحقیقی و تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ وہ یقیناً سودمند ہیں ان کی اثرپذیری سے انکار ممکن نہیں ان بحثوں کے بعد ناقدین کو آئندہ قابلِ عمل ضوابط کا تعین بھی کرنا چاہیے۔

کلامِ رضا کے فرہنگ و تعلیقات اس میں مضمر تہذیب و تاریخ اور ثقافت کے جہان کو آشکار کرسکتے ہیں۔ ان کے فکر و فن اور اندازِ بیاں نے کن کن سرچشموں سے نمو پائی ہے۔ یہ تحقیق و تنقید بے حد موثر ہوگی۔ یہاں تلمیحات معنویت اور تاریخیت کا ایک جہان ہیں۔ صوتی آہنگ کی معنی سے کمال ہم آہنگی ہے۔ نعت کی موضوعاتی وسعت کی نوید بھی یہاں ملتی

ہے۔ کلامِ رضا میں سراپائے رسول ﷺ پر بات کرتے ہوئے جو ضمنی بحثیں سامنے آئی ہیں یہ تصوف سے آگہی اور نعت میں متصوفانہ عناصر کا جائزہ لینے میں معاون ہیں مگر اس ضمن میں دی گئی بعض مثالوں میں جو اشعار محض معجزات کا تلمیحی ذکر لیے ہوئے ہیں۔ ان کا معنوی ربط بھی صوفیانہ مباحث سے جوڑ دینا، عام ذہن کو تذبذب میں مبتلا کرتا ہے جس سے یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا مذہب و تصوف سے کم آگہی کو مولانا کی ہر نعت سے حظ اُٹھانے میں حائل سمجھا جائے؟

فنی و لسانی معروضات کے علاوہ موضوعاتی اختصاص مثلاً میلاد نگاری، معجزات نگاری کے حوالے سے بھی کلامِ رضا کی انفرادیت مسلمہ ہے۔ پیش کردہ حقائق شعریت آشنا ہوئے ہیں تو استناد اور جمالیات دونوں کے آگے سرخرو نظر آتے ہیں۔ کلاسیکی روایت سے جذب و آگہی اور اپنے عارفانہ تخلیقی وجدان سے انھیں اسلوب کا خاص رنگ عطا ہوا ہے۔ مہتاب پیامی لکھتے ہیں:

> ”امام احمد رضا خان بریلوی کے شعری تجربوں اور ان کے Diction سے ایک ایسا وسیع ترین جمالیاتی منظر نامہ تیار ہوتا ہے کہ اس سے عشق کا ایک جہانِ معنی پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔ اعلیٰ حضرت عشق کو اس گہرائیوں میں ٹٹولتے اور چھوتے ہیں اور اس عمل سے ان کے شعری کینوس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ واقعات اور حادثات جمالیاتی تجربوں کی روشنی سے اپنی کئی جہتوں کا احساس ایک ساتھ کرانے لگتے ہیں۔ تجربات اور واقعات کے درخت سے کئی ایک شاخوں کی نمو ہوتی ہے اور ان کی Multicolour تصویریں اور کیفیتیں اُبھرنے لگتی ہیں۔ Diction کی عظمت تجربوں سے پھوٹتی، محسوس ہوتی ہے۔ حیرت تحیّر عشق اور قوت کے حسی جمالیاتی تجربے قاری کو اپنے جلال و جمال، اپنے وقار اور اپنی رفعت و عظمت کا احساس بخشتے ہیں۔“ (ص:۳۱۸)

کلامِ رضا پر تنقید کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات بھی محلِ نظر ہوئی کہ کسی بھی بڑے شاعر کے اثرات کو محض تقلید نہ کہنا چاہیے ہر دور میں شعرا کی اپج، افتادِ طبع اور ممدوح کا مشترک ہونا، مماثل کیفیات کے اظہار کا باعث ہو سکتا ہے خصوصاً جب تخلیق کاروں کا شعور اور لاشعور مشترک تہذیبی سرچشموں سے نمو پا رہا ہو تو مماثلت کا امکان اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اسے تقلید کے زمرے میں لانا مستحسن نہیں۔ یہ نکتہ کسی زود حِس تخلیق کار کو اس قدر محتاط نہ کر دے کہ شعوری گریز کی کوشش اس کا تخلیقی حسن لے ڈوبے۔ اس کے علاوہ کلامِ رضا میں ثقافتی عناصر کی تشکیل کا جائزہ بھی کچھ سوالات پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر کاشف عرفان نے مولانا کے کلام کو جدید تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی سعی کی ہے ان کے ہاں نئے، اہم اور منفرد سوالات کو تنقیدی مطالعے کی اساس بنانے کا رجحان موجود ہے مگر نعت پر ان زاویوں سے تنقید اسی ابہام یا دیر فہمی کو پیدا کرتی ہے جو قدیم اور جدید تنقید کے امتیازات سمجھنے میں در پیش ہوتی ہے۔ تخلیق کے پسِ پردہ بنیادی مرکزے کی تلاش اور اس سلسلے میں موثر عوامل کو سمجھنے کی کوشش شاید دوسری اصنافِ سخن میں زیادہ موزوں موثر اور متنوع ہو، نعت کی تخلیق کے پس پردہ بنیادی مرکزہ تو عشقِ رسولؐ یا تعلق بالرسول ﷺ ہے جس سے تخلیق کار کی وابستگی کی نوعیت زمینی سے زیادہ الہامی ہے اور اس کا اظہار کسی علاقے یا ثقافت سے مشروط نہیں۔ نعتیہ تنقید میں ان پہلوؤں کا جواز تلاش کرنے میں فاضل مضمون نگار نے بے حد تگ و دو کی ہے۔ یہ پہلو سنجیدگی سے مدِّنظر رہنا چاہیے کہ ایسی کاوشوں میں نعتیہ تنقید بے رُخ نہ ہو جائے۔ اپنے موقف میں ساختیاتی تنقید کے متعلق جو آرا درج کی گئی ہیں۔ ان سب کے کہنے والوں کے مد نظر نعت نہ تھی۔ نعت کو ادبی تناظر دینا درست، مگر ہر ادبی رویے یا نظریے کا اس میں در آنا لازم نہیں۔ فن کی تخلیق کے دوران قاری کا فن کار کے ذہن کے نہاں خانوں میں ضرور موجود ہونا بھی تخلیقِ نعت کے لیے لازمی نہیں۔

ساختیاتی مطالعات سے جُڑے تمام تصورات نعتیہ تنقید کا سیاق نہیں ہو سکتے۔ تخلیقِ نعت کی طرح تنقیدِ نعت بھی حزم و احتیاط سے مشروط ہے۔ لازم ہے کہ پہلے یہ تنقیدی

تصورات بجائے خود صریح اور غیر مبہم ہوں پھر ان کا اطلاق نعت پر کرنے کی جسارت کی جائے۔ علم وجدان میں مذہبی مدحیہ شاعری کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

> "یہ روحانی ترفع اللہ کی دین ہے اور سرکارِ دوعالم ﷺ کی نظرِ کرم سے بھی اس کا تعلق ہے۔"(ص:۲۶۱)

یہ رائے نعت کے متعلق اس تمام تنقید میں ہمیشہ موجود رہی ہے جسے مصنف نے "روایتی" اور "اکہرے معنی کی دریافت" قرار دیا ہے اگر ساختیاتی مطالعے کا بھی یہی ماحصل ہے تو اس قدر ذہنی وفکری سیاحت چہ معنی؟؟

ان کے بیانیے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامت پسندی جدّت کی علامت اور علامت سے عدم لگاؤ کا مطلب "روایتی" ہونا ہے جبکہ یہ مزاج کا معاملہ ہے۔ افتادِ طبع قواعد و رجحانات کی پابند نہیں ادب کو مکمل طور پر شعوری عمل قرار نہ دیتے ہوئے بھی انھوں نے تخلیق کار سے نقاد سے جدید منطقی علومِ ادب کو بروئے کار لانے کا کشٹ نہ اُٹھانے کی شکایت کی ہے۔ شعوری ریاضت بھی بہر حال ضروری ہے۔ مسلسل مشق ہر فن کو صیقل کرتی ہے۔ اگر بقول مصنف تخلیق کار کا لاشعور ہی مقدم ہے یا بہر صورت دخیل ہے تو "روایتی" شاعر پر متذکرہ بالا اعتراضات کیوں؟ اسی فکری تضاد اور ابہام نے دس تمہیدی صفحات رنگ ڈالے۔

جدیدیت کا اشتیاق روایت کو یک قلم مسترد کر دینے کو معیوب نہیں جانتا لیکن یہاں ہر بحث کسی ایسے نکتے پر منتج ہوتی ہے جو اس "روایتی" تنقید میں بھی بعینہٖ موجود تھے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> "مولانا کے نعتیہ دیوان کے مطالعے سے برصغیر میں رہنے والے ایک عاشقِ رسول ﷺ کا تصور اُبھرتا ہے جو جسمانی سطح پر تو اپنے شہر میں موجود ہے لیکن اس کا دل اور روح روضۂ سرکارِ مدینہ کا طواف کرنے میں مشغول ہیں وہ اپنی ہر نسبت اس خطۂ زمین سے رکھنا چاہتے ہیں جس کا تعلق آقا کریم ﷺ سے ہے۔ ان کا یہ ذہنی سفر ان کی زندگی کا حصہ بن کر نعتوں میں در

آیا۔"(ص:۲۶۵)

یہ مولانا کا شخصی امتیاز نہیں اور نہ ہی اس کی نشاندہی جدید تنقید کا شاخسانہ ہے بلکہ ہر نعت گو ذہنی و جذباتی طور پر انہی آفاق میں محیط ہوتا ہے۔ یوں نہ ہوتا تو اس ذہنی سفر کے بغیر سرزمینِ عرب سے باہر کوئی نعت گو جنم نہ لیتا۔ مزید لکھتے ہیں:

"مولانا احمد رضا خان بریلوی کی نعتیہ شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے عہد سے قبل کی نعتیہ شاعری کی روایت کو سمجھنے کی ضرورت ہوگی۔"

(ص:۲۶۵)

اگر یہی لوازمہ نقاد کے ملحوظِ خاطر ہے تو یوں گھوم پھر کر ساختیاتی تنقید کے دروازے ہی سے داخل ہونا، شعوری ندرت خواہی نہیں ہے؟؟؟ مصنف نے تقابلی تنقید کے نمونے بھی مروجہ روایتی تنقید کے تحت ہی پیش کیے ہیں مسلکی مخالفین کے خلاف تنبیہی اشعار کے لیے فاضل نقاد نے مولانا کے رویے کا استدلال یوں پیش کیا ہے کہ وہ عشقِ رسول ﷺ کے جس درج پر فائز تھے۔ وہاں وہ کسی بھی سطح معمولی اختلاف برداشت نہ کر سکتے تھے۔۔۔ جبکہ نعت بہرحال توازن کا تقاضا کرتی ہے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ مناصبِ نعت میں اظہارِ عشق روا ہے یا اظہارِ مسلک؟؟ کیا نعت میں مذکورہ بالا رویے کو "قلندرانہ" قرار دینا صحیح ہوگا؟ یقیناً یہ سوال قابلِ غور ہے۔

ساختیات کا جب یہ دعویٰ ہے کہ تخلیق کے پسِ پردہ بنیادی مرکزے کو دریافت کرنا ہے تو نقاد شاعر کے اپنے Dimensions کو دیکھے۔۔۔ یہاں حالیؔ اور رضاؔ کے موازنے میں قدیم تنقیدی رنگ ہے اور موازنہ محض اندازِ اظہار میں ہو رہا ہے۔ مولانا کے کلام پر براہِ راست بھی جن پہلوؤں سے گفتگو کی گئی وہ معلوم اوصاف کو ایک تجریدی رنگ دینے کی کوشش ہے نعت پر یہ تنقید ہر عہد ہی میں ہوتی رہی ہے جبکہ مضمون کے آغاز میں فاضل نقاد چند "نئے" نکات کو لے کر چلنے والے تھے۔

فنی اور لسانی سطح پر غزل کے لحن کا استعمال بھی جداگانہ پہلو سے زیادہ اس وقت کے

اجتماعی ادبی مزاج سے تعبیر کرنا چاہیے البتہ نعت کی تشکیل میں زبانوں کے اختلاط کے تجربے پر کاشف عرفان نے دلچسپ سوالوں کے در وا کیے ہیں مگر کئی دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی یہ معاملہ درپیش ہے کہ ان کے ہاں تنقیدی جہات کی پیشکش بہت زبردست لیکن پیش رفت تشنہ رہتی ہے۔ مولانا کے ہاں زبانوں کے اختلاط کا عمدہ تجزیہ کرتے ہوئے انھیں یہ رعایت بھی عطا کی جارہی ہے کہ نعت میں اس ڈکشن کا استعمال اس عہد کی ضرورت تھا کہ ہر عہد اپنی ڈکشن خود مرتب کرتا ہے۔۔۔ یہ نکتہ یاد دلاتا ہے کہ مضمون کے آغاز میں اپنے عہد کے مطابق لکھنے والے روایتی شاعر کو کس مزمت کا سامنا رہا ہے۔ نعتیہ غزل میں جس ایمائیت کو سراہا گیا، دیکھنا چاہیے کہ بطور "نعت" ان اشعار میں ابلاغ کا دائرہ کیا ہے۔

مولانا کے ہاں لسانی تجربات کی نشاندہی فاضل نقاد نے عمدگی سے کی ہے۔ مگر استعاراتی نظام کے معانی کو مخصوص کر دینے کی کوشش قابلِ غور ہے مثلاً البحر علی والموج طغٰی۔۔۔ کو بحری سفرِ حج سے مربوط کرنے کے بجائے طوفانِ زندگی میں گھرے ہوئے امتی کا استغاثہ و استمداد سمجھنا زیادہ قریب الفہم ہے۔ نیز ان لسانی تجربات کو مولانا کی بے پایاں علمیت کے باعث ان کے تخلیقی لاشعور کی کارگزاری سمجھنا چاہیے نہ کہ شعوری تجربہ کاری ۔۔۔ مختصر یہ کہ موصوف نے نظریہ ترسیل اور لفظیاتی ساختوں کے حوالے سے کچھ "نکات" پیش کیے لیکن آگے چل کر مولانا کی تخلیقات کا جائزہ ان پیش کردہ نکات کے تابع نہیں بلکہ ان کے کئے گئے تجزیات میں روایت پرستی ہی کا فطری عامل صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات مزید وضاحت کی محتاج نہیں کہ کلامِ رضا اور فکرِ رضا پر اس تفکر اور تدبر کا سنجیدہ ذہنوں میں احیا کر دینا اس تالیفِ لطیف کے ثمرات میں رکھا جائے گا اور نعتیہ ادب کے لیے بحیثیت مجموعی کارآمد ہو گا۔

اقبال کی نعت ‌/ فکری و اسلوبیاتی مطالعہ

افکارِ اقبال کی توضیح و تعبیر اور تنقیداتِ اقبال کی بے پایاں وسعت اُردو ادب کو حاصل رہی ہے لیکن ''اقبال کی نعت'' کے عنوان ہی سے وہ تیقّن عیاں ہے جس کے سہارے صبیح رحمانی نے نعت کے مروّجہ تناظرات سے بالاتر ہو کر عظیم شعرائے اُردو کے کلام کو نئی جہات سے دیکھنے کا رجحان پیدا کیا ہے۔ بات صرف ادبی ثمرات تک محدود نہیں، وہ ایک وسیع تر اجتماعی افادیت کا نصب العین اپنائے ہوئے ہیں:

> ''نعت شناسی کے قافلے کو ادب کی اعلیٰ منزلوں تک لے جانے کے لیے اردو زبان و ادب کے ان عظیم شعرا کے کلام میں نعتیہ افکار کی تلاش اوراس کی تفہیم کا اہتمام ناگزیر ہے اس سے ایک طرف تو نعت کا ادبی افق وسیع ہو گا اور دوسری طرف انتشار و ادبار کے اس ماحول میں کہ جب سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی دنیا تغیّر کے پے در پے تجربات سے گزر رہی ہے۔ اپنے ادب اور تہذیب کے بقا اور استحکام کے لیے یہ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی قوتوں اور شناخت کے ایسے حوالوں کو ہر ممکن طریقے سے ابھاریں جو ہماری اجتماعیت کے لیے تقویت کا سامان فراہم کرتے ہوں۔''(ص:۱۰)

کتاب کے انتساب ہی سے وہ ذہنی تنظیم منعکس ہے جس نے مرتب کو موضوع کے پس منظر اور پیش منظر سے پیوست رکھا ہے اقبال کے متعلق صبیح رحمانی کے اس اندازِ فکر کو مہمیز کرنے والے جن ماخذات کا ذکر دیباچے میں ملتا ہے وہ سینکڑوں قارئین کی نظروں سے گزرے ہوں گے لیکن ان کا اکتساب سرسری نہیں ان کی نگاہِ نکتہ بیں حرف حرف کو ٹھہر کر، سنبھل کر اور بار بار مڑ کر دیکھتی ہے، بعض اوقات ایک ایک لفظ کو نئی فکری منازل کا سنگِ میل بنا دیتی ہے۔ انھوں نے اقبال کی نعتیہ فکر کے متعلق آرا اور اقبال کی ذاتی پسندیدگی سے ان کا مطمعِ تخلیق اخذ کرنے کی کوشش کی ہے توضیحِ فکرِ اقبال کا یہ جذبۂ وسیع انھیں نوادراتِ اقبال کی فراہمی پر بھی آمادہ کرتا ہے جس کے بعد انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ نعتیہ عناصر سے صرفِ نظر کرنا، شعر و فکرِ اقبال کی ایک بہت محکم کیفیت کی نفی کے مترادف ہو گا۔ اس ضمن میں اہم تنقیدی جہات کو فروغ دینے کا عمل ایک سودمند تحریک ہے جس کی بنیاد انھوں نے اوّلاً اپنے تنقیدی افکار سے رکھی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ملّتِ اسلامیہ کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسئلے کو جس طرح اقبال نے اپنی شاعری میں فکر کی اعلیٰ سطح پر بیان کیا، اس کی سب سے بلیغ اور اثر انگیز صورت ہمیں ان کے یہاں اس وقت ملتی ہے جب وہ اسے نعتیہ آہنگ میں پیش کرتے ہیں اس مرحلے پر اقبال کی نعت بیک وقت دو معنوی جہتیں پیدا کرتی ہے ایک عقیدت و محبت کی دوسری دادرسی اور شفاعت کی۔ مذہب، سیاست، عمرانیات، معنویتِ حیات اور شعورِ کائناتی کے تناظر میں سامنے آنے والے یہ نعتیہ عناصر زبان و بیاں، اظہارِ عشق و عقیدت، جدت و ندرت اور انفرادیت و شعور کی اس سطح پر معرضِ اظہار میں آتے ہیں کہ جہاں فن معجزہ بن جاتا ہے۔'' (ص:۱۸)

اقبال کے نعتیہ آہنگ کو جن روایتی یا جدید میزانوں پر پرکھا گیا اس تنقیدی عمل کا ارتقا اور تنوع مضامین کے انتخاب میں مرتب کے پیشِ نظر رہا ہے۔ جس سے تنقید و تحقیق کے منفرد زاویے سامنے آئے ہیں جو نہ صرف اقبال کی نعت بلکہ من حیث المجموع نعتیہ ادب کے لیے باثمر رویہ ہے۔ اقبال کے ہاں نعت کے غیر روایتی پیرایہ ہائے اظہار کی تلاش، دریافت اور تحسین درحقیقت صنفِ نعت کے ارتقا کو مہمیز کرنا ہی ہے تاکہ وہ پختہ فکر پنپ سکے کہ ایک کلیدی نکتے میں سوچوں کے سب حوالے ایک تخلیقی تجربے کا جزو ہو جائیں۔ صبیح رحمانی کے بقول:

> ”آج کے شاعر کے لیے دیکھنے اور کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے عہد سے فکری اور حسی وابستگی کا ہنر تو اقبال اور اس کی طرزِ سخن سے سیکھے لیکن اس کی معنویت کے لیے اسے اپنے عہد سے رشتہ استوار کرنا ہوگا اور اپنے عصر کے ذہنی، عقلی، جذبی اور نظری تناظر کو اپنے تخلیقی تجربے میں ڈھالنا ہوگا۔“(ص:۱۹)

فکرِ اقبال میں اسلام سے محبت کا عنصر ابتدا ہی سے گھریلو ماحول اور تربیت کے محرکات سے فروغ پاتا رہا ہے ان کی شاعری میں یہ جذبہ یوں سرایت کر گیا ہے کہ اقبال کی شعری فضا ابتدا ہی سے عشق رسول ﷺ سے نمو پاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ”اقبال کی نعت“ میں شامل مضامین میں اقبال کی محولہ نثری نگارشات سے وہ تمام پہلو سامنے آتے ہیں جو اقبال کی حضور پاک سے بے پایاں عقیدت کا باعث رہے ہیں۔ پختہ فکر پر مبنی یہ عقیدت اقبال کو اسلامی ادب کو حشو و زوائد سے پاک کرنے کا عزم عطا کرتی رہی ہے۔ سیرت النبی ﷺ کے مطالعے سے اقبال نے کامل مسلمان کے جو خصائص اخذ کیے ہیں اور اپنے شعری افکار سے جس طرح ان کی تبلیغ کی ہے یہ رویہ اسلامی ادب کو ایک منصب اور نہج عطا کرتا ہے اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی ادب کی سب سے توانا جہت، نعت گوئی ہے گویا اقبال

کے نعتیہ افکار اور اختصاص کو اجاگر کرنا عہدِ حاضر میں نعت گوئی کو وسیع کینوس عطا کرنا ہے جو ذکرِ رسول ﷺ کو والہانہ عقیدت کے لیے اور گہرے اکتساب سے پیدا کردہ تیقّن بخشتا ہے، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"جس طرح علامہ اقبال نے اسلام کو سمجھانے کے لیے ایک نئے اندازِ فکر کی تشکیل کی تھی اسی طرح حضور انور ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے صحیح فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایسے نکات کی نشاندہی کی ہے جو عموماً اہلِ علم سے پوشیدہ ہیں۔"(ص:۵۹)

یا پھر سیّد عابد علی عابد کے الفاظ میں:

"اقبال نے مقامِ رسالت پر جو کچھ لکھا ہے وہ عقیدت کے اس مقامِ پُر اسرار سے لکھا ہے جسے محبت کہتے ہیں۔"(ص:۶۴)

یہ مقام تمام فلسفہ ہائے عالم سے ماورا ہے اور بیک وقت عرفان و آگہی کا سنگِ میل اور منزلِ مراد بھی ہے۔ اقبال نے حضور پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس کو جن جواہر سے بدرجۂ کمال متصف پایا ان کی پیروی اور ان کے حصول کی خواہش کو ایک مردِ مومن کا مقصد بنا کر پیش کیا اس پیغام کی ترسیل نے خود بخود اُن نعتیہ مضامین کو جنم دیا جو مروجہ معیارات سے بڑھ کر بلکہ ان سے مختلف ہیں ہر نعت گو کے ہاں عشقِ رسول ﷺ سیرت النبی ﷺ اور فیضانِ سیرت النبی ﷺ ہی بنیادی طور پر لازمۂ فن ٹھہرتے ہیں لیکن اقبال نے اکتسابِ فیضانِ محمدی کو بہ اندازِ دگر دیکھا ہے اور اس کے اظہار کو علویت اور ترفع عطا کر دیا ہے۔

زیرِ نظر مضامین میں فکرِ اقبال کے ان پہلوؤں کو نعت کے حوالے سے بطورِ خاص موضوعِ بحث بنانے کا مقصد محض تنقیداتِ اقبال میں اضافہ نہیں بلکہ اقبال کی معجز بیانی سے اردو نعت کے لیے نئے افق وا کرنا مقصود ہے۔ اقبال نے جس فکری و ذہنی ریاضت کے ساتھ اپنے جذبۂ عقیدت کو باثمر کیا ہے یہ ریاضت اس نعت گو کے لیے لازم ہے جو سنجیدہ ادبی

مزاج کے ساتھ صنفِ نعت کو بلند ترین انسانی اکتسابات کا رہنما بنانا چاہتا ہو۔ یہ منصب اپنا لینے کے بعد نعت گو کے لیے اسلامی فکر کا تاریخی مطالعہ اور ادراکِ حقیقت کا شعور ناگزیر ہے۔ خدا، رسول ﷺ اور اسلامی شریعت سے متعلق شفاف تصوراتِ علم و عمل ضروری ہیں اگرچہ اُردو نعت امت مسلمہ کی زبوں حالی کے سبب استغاثہ کا ایک انداز پہلے ہی اپنائے ہوئے تھی لیکن اقبال نے اُمت مسلمہ کی بے اعتدالیوں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے اور تمام زاویہ ہائے فکر و نظر سے تقطیر کر لینے کے بعد اس انداز کو آگے بڑھایا ہے جو نہایت ذمہ دارانہ اعترافات کے بعد اُمیدِ کرم رکھتا ہے۔

اقبال کا سرچشمۂ فکر قرآنِ مجید ہے۔ قرآن کا عمیق مطالعہ انھیں جو تصورات عطا کرتا ہے ان کی انتہائی تجسیم حضور پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس میں رونما پا کر وہ حقیقتِ محمدی ﷺ سے لَو لگاتے ہیں یہ امر ایک مسلمان کی فکری رہنمائی کے لیے بالخصوص نعتیہ ادب کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اقبال کی رباعیات میں جو نعتیہ مضامین ملتے ہیں۔ ان میں حاضری کا شوق اور والہانہ عقیدت وخودسپردگی نمایاں ہے، گرمیٔ شوق نے حسبِ کیفیت فنی پیکر تراشے ہیں۔ سفر حجاز کی تمنا انہی استعارات و علامات میں حلول کر گئی ہے جو حجازی نسبت رکھتے ہیں قلب کی حضوری کو پانے کے لیے مقامِ حاضری کے تمام سیاق وسباق کو تخیل میں سجا لینا اور ایک مراقبے کی کیفیت میں عرضِ حال کرنا اس اخلاصِ آرزو کا مظہر ہے جو نعت اور نعت گو کو اعتبار بخشتا ہے۔ پھر یہ مضامین محض خواہشِ قرب کے اظہار تک محدود نہیں بلکہ اپنے دل کی کیفیت کے اظہار کے ساتھ قدم بہ قدم فیضِ نگاہِ محبوب ﷺ اور عشقِ نبی ﷺ کے مقامات و ثمرات مثلاً نورِ بصیرت اور جذبۂ شوق و عمل بھی پیہم بیان ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری نے اقبال کی رباعیات میں نعت کا جائزہ کن جہات سے لیا ہے اور نعتیہ شاعری میں ان کا مقام کیونکر متعین کیا ہے اس کا اندازہ ان سوالات سے ہوتا ہے جو انھوں نے اس ضمن میں قائم کیے ہیں:

> ''ان رباعیوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا مذہبی شعور اور جذبے کی شاعری اچھی شاعری ہو سکتی ہے؟ کیا یہ شاعری ایسی وابستگی یعنی Commitment کا مطالبہ کرتی ہے جو آزادانہ اظہارِ رائے میں رکاوٹ بنے؟ یعنی کیا یہ تجربے کی بھرپور تجسیم پر کسی طرح کی پابندی عائد کرتی ہے؟ کیا اچھی شاعری کے لیے محض جذبے کی تندی اور اس کا اخلاص اور کھرا پن یعنی Genuineness کافی ہے؟ کیا فنی تزئین اور آراستگی اس جذبے کے اظہار کی ضد ہے؟ وہ اصناف جن کے مابین فرق کرنا ضروری ہے وہ ہیں Devotional شاعری اور مذہبی شعور کی گہرائیوں سے برآمد ہونے والی شاعری۔۔۔ ان رباعیوں کی بساط وسیع ہے، یہاں کلام کا وہ مروّجہ ڈھانچا بھی استعمال نہیں کیا گیا جو نعتیہ کلام کے لیے متعین شدہ ہے۔''(ص:۹۹)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ سوالات اور اس تصنیف میں بکھرے ہوئے کئی ایسے نکات ہیں جو نعتیہ اصنافِ شعری کے لیے معیار بنائے جانے کے قابل ہیں ان تمام تحریروں میں جو نکتہ مشترک ہے وہ اقبال کے ہاں مروّجہ نعت گوئی سے ہٹ کر مدحتِ رسول ﷺ کا جداگانہ انداز و معیار ہے۔ ان کے ہاں عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ بنیادِ عمل بن کر مقاصدِ جلیلہ کی پیروی کا عزم پیدا کرتا ہے۔ یہ فکر اقبال کے پیش کردہ تمام تصورات میں سرایت کر گئی ہے اور سیرت النبی ﷺ کے ابدی اثرات کو جاں فروزی سے بیان کر رہی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> "اقبال کی شاعری میں مدحتِ رسول ﷺ روحِ محمد ﷺ بن کر ان کی ساری فکر اور ان کے سارے کلام میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ وہ الگ سے نعت گوئی کی طرح وجود نہیں رکھتی۔ فکرِ رسول ﷺ ان کے لیے صرف عقیدت ہی نہیں، بلکہ ساری زندگی ہے۔ اقبال کی شاعری اسی لیے روحِ محمد ﷺ کے اظہار و اعلان کی شاعری ہے۔"(ص:۱۰۳)

فکرِ اقبال میں ذاتی کیفیاتِ عشق اور اجتماعی کرب کے احساسات کے ادغام نے ایک کیف پیدا کیا ہے۔ ایک مومن کے فکر و نظر فیضانِ محمدی ﷺ سے جِلا پاکر اُسے اُمت کے لیے کارساز بنا دیتے ہیں۔ اقبال نے اس کردار سازی کو نعتیہ شاعری کا نصب العین بنا دیا ہے۔ اقبال کے پیش کردہ تناظرات کو محض تنقیداتِ اقبال کی زینت بنا دینا کافی و شافی نہیں بلکہ اس مجتہدانہ فکر کے احیا کی ضرورت ہے زیرِ نظر مضامین کا مطالعہ یقیناً اس کارِ عظیم کے لیے بنیادی محرّک ہو سکتا ہے۔ یہ امر بھی مستحسن نہیں کہ رسمی نعت اور غیر رسمی نعت کے جُدا جُدا تناظرات ہر دو طبقات کو جواز و تحسین فراہم کرتے رہیں، بلکہ وقت آ چکا ہے کہ اُردو نعت من حیث المجموع ان معیارات کو مطمعِ نظر بنالے جو قرآن و سُنّت سے ماخوذ اور کشف و آگہی سے معمور ہوں۔ اقبال کی نعت اس امر میں ایک بہترین رہنما کا کردار ادا کر سکتی ہے۔

اقبال کے نزدیک آپ ﷺ محسنِ انسانیت اور مضمرِ عالم ہیں۔ وہ نورِ مصطفیٰ ﷺ سے مسلم امت کے ظلمت خانے میں ایک روشن انقلاب کی توقع کرتے ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک کے بقول:

> "اقبال سراپا نگاری کے رسمی موضوعات سے اعتنا نہیں کرتے۔ ان کی توجہ ہمیشہ باطنی اور خارجی زندگی میں اس انقلاب پر مرکوز رہتی ہے جو آنحضور ﷺ کی مبارک زندگی اور تعلیمات سے پھوٹا تھا۔۔۔ حریت، اخوت اور مساوات کی انسانی اقدار کی بازیافت کی تمنا اقبال کو بار بار

آنحضور ﷺ کی انقلابی تعلیمات کی طرف متوجہ کرتی ہے اور وہ بار بار، مگر ہر بار بہ اندازِ دگر آنحضور ﷺ کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں۔"

(ص:۱۱۵۔۱۱۶)

اقبال کے نزدیک یہی راہِ فلاح و نجات ہے۔ شارعِ اسلام کا تاریخی کردار، قرطاسِ عالم پر رقم کر دینا نعت کا منصبِ عالی ہے جسے اقبال کی نعت نے بخوبی نبھایا ہے، احیائے اسلام کی خواہش نے اسے جوش اور قوت عطا کی ہے۔ قرآن کا عطا کردہ طریقِ زندگی جو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے مترشح ہے وہ اقبال کے نظامِ فکر و حرف کا محور ہے۔ ان مقدس مآخذ سے اکتساب کی اساس رسول اللہ ﷺ کے لیے ان کی گہری اور شدید محبت پر ہے جو لامحالہ ان کا کلام پڑھنے والوں کے دل میں بھی جذباتِ محبتِ رسول ﷺ کو بھڑکا دیتی ہے اور اقبال کا گہرا تفکر اور ان کی بے بہا بصیرت قلبِ مسلماں کو ان بے اعتدالیوں سے بھی محفوظ رکھتی ہے، جو قدما کے مضامین ہائے نعت میں روا رہی ہے اس کے برعکس اقبال کا شاعرانہ تفکر نبضِ کائنات میں روحِ محمد ﷺ کو دھڑکتا ہوا محسوس کرتا ہے جس کی وہ والہانہ، عاجزانہ، عاشقانہ، دانشمندانہ اور بے تابانہ تفسیر کرتے ہیں تو دلوں پر جذب و کیف اور تاثر و تحرّک، سبھی کچھ طاری ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے بقول:

"ان تمام مسلمان مفکرین کی طرح جو مختلف ادوار میں احیا و تجدید روحِ اسلامی میں کوشاں رہے، اقبال کی بھی یہی کوشش رہی کہ انسانیتِ کبریٰ کے اس نصب العین کو جو رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی میں مجسم ہوا، ایک دفعہ پھر مسلمانوں کے سامنے بالخصوص اور عالمِ انسانیت کے سامنے بالعموم پیش کریں۔ ان کی تمام فلسفیانہ، متصوفانہ اور مصلحانہ کاوشوں کا جوہرِ اصلی یہی ہے کہ صاحبِ قرآن کی عطا کردہ بصیرتوں کو عام کریں اور عصرِ حاضر کے انسان کو اس کی اصلی منزل سے روشناس کرائیں۔" (ص:۱۷۸)

اس تصنیف میں ناقدین اور محققین نے جس طرح اقبال کے نعتیہ کلام اور افکار کو قدیم و جدید معیارات اور مذہبی و ادبی مقتضیات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد وقیع اور موثر قرار دیا ہے یہی عمل نعتیہ تنقید کے سب حوالوں میں امرِ مشترک ہونا چاہیے۔ مگر تفہیم اقبال کے لیے منفرد اندازہائے نظریوں ضروری ہیں کہ اقبال کے ہاں حضور پاک ﷺ کی ذاتِ گرامی تمام افکار کا منبع و محور ہے لہٰذا چند مخصوص کلاموں کو لے کر نعتیہ تنقید کے معیارات سے ہم اقبال کا مقام متعین نہیں کرسکتے ان کا کلام من حیث المجموع اس تجلی سے ہمکنار ہے وہ سماج اور فطرت، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کا مطالعہ اسی اثر کے تحت کرتے ہیں اس لیے کسی مخصوص سانچے کے بجائے کلامِ اقبال میں تجلیاتِ نعت یہاں، وہاں چمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ بقول مبین مرزا:

> ''کم و بیش وہ سب اہم فکری عناصر جو کلامِ اقبال کی جداگانہ شناخت قائم کرتے ہیں اور ان کے خیالات و تصورات کی صورت گری کرتے ہیں، وہ اپنے بلیغ ترین بیانیے کے کسی نہ کسی مرحلے پر یا تو نعتِ رسولِ کریم ﷺ کا کوئی پیرایہ اختیار کرلیتے ہیں یا پھر وہاں حضور ﷺ کا ذکر یا نعت کا کوئی شعر آکر اس حقیقت کو واضح کردیتا ہے کہ فکرِ اقبال کا یہ منظرنامہ کس ماخذ سے رنگ و نور اخذ کر رہا ہے یہی سبب ہے کہ ایسے دوسرے شعرا جو اپنا ایک فکری تناظر رکھتے ہیں، ان کے برخلاف اقبال کے یہاں مابعد الطبیعیاتی افکار کا دائرہ بھی نعتیہ اسلوب کی وجہ سے مجرّد نہیں رہتا، محسوس بن جاتا ہے۔''
>
> (ص:۲۲۸۔۲۲۹)

تفہیم اقبال کے لیے قاری اور ناقد کو اُردو کے موجودہ تنگنائے تنقید سے نکل کر غور و تدبر سے کام لینا پڑا۔ شعری جمالیات، معنیات اور اسلوبیات کے مآخذ پر از سرِ نو غور کرنا پڑا۔ اقبال کی نعت کا تجزیہ کرتے ہوئے تنقیدِ نعت نے ازخود اپنا دامن وسیع کرلیا ہے۔ مذہب،

تہذیب اور تاریخ کے لوازم کو جذب کر لیا ہے۔ اقبال کے تمام افکار کی اساس ایک ذاتِ کامل ﷺ اور سیرتِ طیبہ کے فیضان سے جا ملتی ہے۔ جبکہ ان افکار کا اظہار گونا گوں موضوعات کے تحت ہوا ہے یہ امر اس سمت رہنمائی کرتا ہے کہ صنفِ نعت اپنے اظہار میں محض عقیدت اور جذبے کی مظہر نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام تر شعبہ جات کی نمائندہ ہو سکتی ہے اور اس پہلو سے دیکھیے تو نعت ان تمام اصنافِ سخن کے لیے جو کسی پختہ شعور اور بالغ فکر معاشرے کا تہذیبی اظہار ہوں۔۔۔ ایک حیات آثار دھڑکن بن جاتی ہے۔

مرتبۂ رسالت کا ادراک و اظہار، تعلیماتِ رسول ﷺ کا پرچار، دونوں ہی نعت کے مناصب میں شامل ہیں۔ اقبال نے جذباتیت سے مملو ان موضوعات کو تفکر آشنا کر دیا ہے اس لیے اقبال کے نعتیہ افکار کی تفہیم اور ترویج فکری اعتبار سے نعت کے لیے قوت آفرین عمل ہے۔ اقبال کا تلمیحی و استعاراتی نظام اور علائم و رموز جن تاریخی و تہذیبی چشموں سے فروغ پاتا ہے۔ یہ تنقیدی مقالات تجزیہ و تحلیل کے ذریعے اس افہام کا دائرہ وسیع کر رہے ہیں جو یقیناً آنے والے وقت میں نعت گو شعرا کو بلند آہنگ معیارات کا قائل کر دے گا۔

دینیات، سماجیات، اخلاقیات اور سیاسیات میں عشق و سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کی اساس پر عمل اور تجربے کی دعوت دے کر اقبال نے صنفِ نعت کو بہترین مناصب سے روشناس کرایا ہے۔ امتِ مسلمہ کے لیے بہترین چارۂ کار بھی یہی ہے۔ فکر و تدبر اور ہوشمندی کے ساتھ حضوری کی خواہش کا ایک دیوانہ وار جذبہ بھی پیہم رواں دواں ہے۔ لذتِ شوق کے اظہار میں بھی اقبال کا جواب نہیں مگر ان کی قوتِ اظہار غیر متوازن نہیں ہوتی۔ گہری اور شدید ذاتی کیفیات کے بیان میں بھی وہ ممدوحِ کامل ﷺ کے مراتب کو باہوش و حواس ہی بیان کرتے ہیں اور پیغام بر آری کا فرض بھی نبھا ہی جاتے ہیں۔۔۔ ان سب حوالوں کے اخذ کرنے کو گداز دل اور تازہ فکر درکار ہے۔ تبھی اقبال کی نعتیہ شاعری سے یہ فکری اکتساب ممکن ہو گا کہ رسولِ پاک ﷺ سے محبت کی شہادت، اطاعتِ رسول ﷺ میں ہی مضمر ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں نعتیہ افکار کی جو سطح دریافت کی گئی وہ بتدریج قائم نہیں ہوئی۔ اقبال کے ابتدائی کلام ہی سے یہ افکار ایک تنظیم اور گرمجوشی سے ظہور پذیر ہورہے ہیں۔ اس کتاب میں مشمولہ مضامین سے تفہیم اقبال کے جو زاویے آشکار ہوئے ہیں، ان افکار کی تہ میں پنہاں عقائد و نظریات کو ٹٹولنا ایک علمی ریاضت ہے اور سرمایۂ نقدوادب میں کشف و آگہی کا رَس شامل کرتی ہے۔

مطالب کو سمجھنے کے متنوع انداز، تحقیق و تنقید کے راستوں سے ایک دوسرے کے روبرو ہوتے ہیں اور ظفریاب راستوں کا تعین کرتے ہیں۔ مطالعۂ اقبال کے توسط سے ان عوامل کا اجاگر ہونا، نیز کلامِ اقبال کے نعتیہ عناصر کو قدیم وجدید، مشرقی ومغربی معیارات کے آگے سرخرو قرار دینا، صنفِ نعت کو فکری وفنی ارتقا کے لیے مہمیز کر رہا ہے۔ اقبال نے خود اپنے کلام کی تفہیم کے لیے حقائقِ اسلامیہ کا جاننا ضروری قرار دیا، نعت کے حوالے سے کلامِ اقبال کے اس جوہر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نعتیہ نقد و ادب کے مناصب متعین کرنا ناگزیر ہے۔

نعت نگر کا باسی/ ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی کی نعت گوئی و نعت شناسی کا ایک جائزہ

اس کتاب کا نام کشفی صاحب کی نعت سے وابستگی کا عکاس ہے۔ صبیح رحمانی نے ابتدائیے میں قیام پاکستان کے بعد کے منظر نامے میں کشفی صاحب کی راست تنقیدی فکر اور دینی حوالے سے ادب کی تربیت کا ذکر مختلف حوالوں سے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مختلف کتابوں میں کشفی صاحب کے لکھے ہوئے دیباچے اور پیش لفظ، رسائل و جرائد میں شامل مضامین، فلیپ، آراء اور تاثرات کی فہرست بھی مہیا کی ہے یہ بات ان کے مزاج کا حصہ ہے کہ اصل اور مرکزی بات پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بھی وہ تحقیق، تنقید اور دریافت کی نئی نئی راہیں کھولتے جاتے ہیں۔

کشفی صاحب نے جس ادبی فضا میں نعت کو ترجیحاً اپنایا اور اس حوالے سے ثمرات نظم و نثر کو جس متانت سے سامنے لائے اس سے واضح ہے کہ ان کی پختہ فکر نے انھیں بیک وقت بطور شاعر اور نقاد خاطر خواہ استحکام اور اعتماد عطا کر رکھا تھا۔ صبیح رحمانی لکھتے ہیں:

> ”اسلامی ادب کی تفہیم، تحسین اور پرکھ کے معاملے میں کشفی صاحب کا نام اس لیے سرِفہرست رہا کہ ان کی ادبی رائے مسلّم، ادب شناسی غیر متنازعہ،

مذہبی لٹریچر سے آگاہی لائقِ تقلید اور بلند ذوقی قابلِ رشک ہے۔ کشفی صاحب نے نعتیہ مجموعوں پر تقاریظ و تبصرے اور دیباچے لکھ کر گویا اُردو کے معروف نقادوں کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔"(ص:۸)

زیرِ نظر مضامین میں کشفی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو سب سے نمایاں ہے کہ وہ جس طرح نعت کو اپنے وجود کی سچائیوں سمیت حضور ﷺ کی خدمتِ عالیہ میں حاضری گردانتے تھے اسی طرح ان کی زندگی بھی یادِ حضور کے احاطے میں بسر ہوتی رہی گویا ان کی شخصیت اور اسلوب کو باہم ملا کر دیکھے بغیر چارہ نہیں۔ ہر تخلیق کار یا تنقید نگار کے مزاج کے مستحکم پہلو ہی اس کے اسلوب میں بعض مستقل عناصر کا باعث ہوتے ہیں۔ مگر ادبی جائزہ بہر طور، شخصیت سے کچھ زیادہ فن اور اسلوب پر مرکوز رہنا چاہیے۔ پروفیسر شفقت رضوی نے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی نعت شناسی کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے۔ کشفی صاحب کے اسلوب میں جو سہولت، اختصار اور جامعیت کی خوبی ہے اس میں کچھ کلام نہیں مگر پروفیسر موصوف نے ان داخلی اوصاف کے غلبے میں کشفی صاحب کے پیش کردہ تصورات کا معروضی جائزہ لینے میں توازن کا مظاہرہ کیا ہے۔

کشفی صاحب کا عملِ تخلیق جس وجدانی قوت سے نمو پا رہا ہے اس کو کماحقہٗ سمجھنے اور متبرک قرار دینے کے بعد انھوں نے اس حقیقت کو قرینے سے بیان کر دیا ہے کہ بطور شاعر ان احساساتِ قلبی سے اثر پذیر ہونا درست مگر اس شخصی زاویۂ نظر کو بطور نظریۂ شعر پیش کرنا قابلِ غور ہے۔ لفظ کی ادائی، لہجہ مضمرات، مترادفات کے متعلق کشفی صاحب کے پیش کردہ قابلِ فہم نکات سے اتفاق کرتے ہوئے انھوں نے یہ موقف بھی پیش کیا ہے کہ شعر کی تخلیق میں شعور کے دخل کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لکھتے ہیں:

"نفسیاتی طور پر اس (شعر) کے امکانات سے انکار ممکن نہیں لیکن ان کا یہ کہنا کہ شاعر ایک شعر کہتا ہے اور اس کے مفہوم سے کماحقہٗ طور پر واقف ہی

نہیں ہوتا، درست نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تخلیقی عمل کی پیچیدگی
میں ہر مرحلہ اس پر پوری طرح روشن نہ ہو لیکن تخلیقی عمل سے گزرنے کے
بعد اپنے تخلیقی عمل کے حاصل پر وہ غور تو کرتا ہے اور اس میں لفظی و معنوی
ترمیم و اصلاح بھی کرتا ہے۔ ایسے لمحات میں معنوں اور اس کے پہلوؤں پر
غور و فکر کا موقع تو مل جاتا ہے۔"(ص:۸۵)

یہ حقیقت ہے کہ نقاد اگر خود تخلیق کار بھی ہے تو اس کی تخلیقی حسیت اور رویہ، لامحالہ اس کے اندازِ تنقید پر بھی سایہ فگن رہیں گے۔ ممکن ہے کشفی صاحب خود اسی وجدانی کیفیت سے گزر کر شعر کہتے ہوں جو شعوری کاوش سے مستثنیٰ ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ہاں اِن نظریات کی پیشکش نئے مباحث اور نتائج کا باعث ہوئی۔ پروفیسر شفقت رضوی کے بقول:

"اس مقصد میں یہ حوالہ غیر ضروری نہ ہو گا کہ کشفی صاحب کے عالمانہ
خیالات کی اشاعت کے ساتھ ان سے اختلاف کرنے والوں کے خیالات کو
بھی نعت رنگ میں جگہ دے کر غور و فکر کے نئے دریچے کھولے جا رہے
ہیں۔"(ص:۸۳)

یہی غور و فکر بعض صائب اور متوازن آرا کو صریح صورت میں سامنے لے آیا جن کو فاضل مضمون نگار نے عمدگی سے مجتمع کیا ہے۔ جس سے ذاتی خیال اور عمومی صداقت کا فرق سامنے آتا ہے۔ کشفی صاحب کی حرف شناسی، علمی وسعت اور فن شناسی میں ان کی دھیمی شخصیت نے ایک ایسا تاثر رکھا ہے کہ اختلافی صورتیں کشیدگی کا باعث بننے کے بجائے اہلِ نظر میں محسوسات کے تقرّب کا اہتمام کرتی ہیں۔

ڈاکٹر عزیز احسن نے شاعری میں مذہبی احساس کے فقدان کے حوالے سے کشفی صاحب کی شاعری کو بالاختصاص دیکھا ہے اور اس میں خود آگہی، برجستگی اور صداقت کے جو

ہر تلاش کیے ہیں۔ لفظی تصویر کشی، واسع الامکان لہجہ اور اثر انگیزی کو کشفی صاحب کے شعری امتیازات کے طور پر ان کی نعت میں دریافت کیا ہے۔ ڈاکٹر عزیز احسن نے نسائی جذبات کی نقش گری کے لحاظ سے ”نسبت“ کے اختصاص کی جو نشاندہی کی ہے۔۔۔ یہ موضوع ایسی خوشگوار حیرت سے دوچار کرتا ہے کہ نعتیہ شاعری میں فروغِ امکانات کی یہ مثال کیسی منفرد لطافت کی حامل ہے:

> ”نسبت“ میں ایسی شاعری کے نمونے بھی موجود ہیں جو ایک پاکیزہ خیال اور انسانی رشتوں کی اہمیت کا دینی سطح پر ادراک رکھنے والے شوہر کی فکری راست سمتی کے آئینہ دار ہیں۔ نعت گوئی کے الہامی لمحوں میں جہاں جہاں کشفی صاحب کو اپنی اہلیہ کا خیال آیا ہے انھوں نے اپنی التماس میں اپنی شریکِ زندگی کا نام ضرور شامل کیا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ ایک دعا، ایک نعت کشفی اور بلقیس کی طرف سے، ایک گواہی بلقیس کے لیے، ایسی تخلیقات ہیں جن میں انسانی رشتوں کے پاکیزہ جذبات کی عکس گری کی گئی ہے اس حوالے کی وجہ سے نعت کو عملی زندگی سے قریب سے قریب ترلانے کی کوشش کرنے والے شعرا میں کشفی صاحب کو اوّلیت حاصل ہے۔“(ص:۱۰۰)

کشفی صاحب کا شعری سرمایہ مزید وسعت اور تجربات کا متحمل ہو پاتا تو یقیناً اسلوب کی یہ ندرت اور حلاوت صدہا، رنگ دکھاتی مگر موجودہ سرمائے کی رہبری ہی میں ایسے تجربات سے صنفِ نعت ثروت مند ہو سکتی ہے کشفی صاحب کے مجموعے ”نسبت“ کے حوالے سے ناقدین نے جو تبصرے فرمائے ان میں کشفی صاحب کا نسبتِ رسول ﷺ پر افتخار، کیف و وجدان کی لطافت، شہر مدینہ کے لیے محسوسات کی وارفتگی، عظمت و سیرتِ رسول ﷺ کی اجاگری حسنِ تغزل اور طہارتِ فکر پر اظہارِ رائے کیا ہے۔ سفری مثالیں مذکورہ خصائص کی موجودگی کا بخوبی پتہ دیتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر اسحاق قریشی:

"ادبی حوالہ لائقِ توجہ ہے تو تنقیدی شعور دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ فنی محاسن جاذبِ نظر ہیں تو دینی ادب کی سرفرازی کا ایقان بھی لَو دے رہا ہے۔ نعت ان کا ذوق بھی ہے اور وجہِ قرار بھی۔۔۔" (ص:۱۱۸)

کشفی صاحب کی نعت زندگی کے ہر میدان کی طرح علمی و ادبی رہنمائی بھی حضور پاک ﷺ کی ذاتِ گرامی سے طلب کرنے کی داعی ہے۔ کائنات کے تاریخی و سماجی تناظر میں آنحضور ﷺ کی افضلیت کی تائید کے کون سے حوالے سامنے آتے ہیں یہ احساس ان کے اشعار کو بغور پڑھ کر نصیب ہوتا ہے۔ شعورِ حقیقتِ محمدی ﷺ کو پانے اور اس کے نسل در نسل منتقل ہونے کی خواہش ان شعروں میں دعا بن کر جھلکتی ہے۔ ان اشعار کی فنی قدر و قیمت یا یوں کہیے کہ قد و قامت کا صحیح تعیّن ہنوز تشنگی کا شکار ہے۔ بعض لکھنے والوں نے کشفی صاحب کے شخصی اوصاف گنوانے میں تمام زور صرف کر دیا ہے اور بجائے خود ان کی تخلیقات کو ادبی تجزیے کے عمل سے کماحقہٗ نہ گزار سکے۔

ناقدین نے کشفی صاحب کے نظریۂ نعت کے متعلق مشترک خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کشفی صاحب نے نعت کے موضوعات کے متعلق جو لکھا اسے اکثریت کی قبولیت حاصل ہے۔ مطالعۂ نعت کے لوازم میں کشفی صاحب نے سماجی عوامل کو بھی مدّ نظر رکھا ہے۔ نئ اصناف کا خیر مقدم اوران اصناف میں نعت کہہ کر کشفی صاحب۔ نعت میں تجربات کا دامن وسیع کرنے والوں میں شامل رہے ہیں۔ کشفی صاحب کے مجموعۂ مقالات "نعت اور تنقیدِ نعت" کے متعلق پروفیسر واصل عثمانی لکھتے ہیں:

"اس کتاب کے تمام مضامین نعت سے متعلق ہیں مگر ان میں علم کلام، تنقید، شاعری، ادب، لسانیات، مذہبیات، فلسفہ، تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے علاوہ آدابِ زندگی، معاشرت، ترجمہ، تفسیر، سیرت و سوانح کے قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ غزل، گیت، قصیدہ، رباعی، نظم معرا، نثری نظم، سانیٹ، انشائیہ

اور ہائیکو پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نعت کس صنفِ سخن میں بطریقِ احسن کہی جا سکتی ہے۔ اس کاوش میں انھوں نے بہتوں کے عبادتِ فن کا قبلہ درست کرنے کی بھی سعیِ مشکور کی ہے۔" (ص:۱۳۶)

کشفی صاحب کے تنقیدی شعور پر رائے دینے میں تمام مضمون نگاروں نے متفقہ طور پر اس بات کا ذکر کیا ہے کہ "لفظ" کے استعمال پر کشفی صاحب کی آرا اور نکات مدلّل، جامع اور فکر انگیز ہیں۔ "نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم" ان کا ایسا مقالہ ہے جس سے مستفیض ہو کر لفظ کی قوت اور معنویت سے آگاہ ہونا، مختلف النوع طبائع کے لیے ممکن ہے کیونکہ جامعیت اور آفاقیت کی حامل تحریریں ہر مزاج کے لیے جاذبیت رکھتی ہیں۔ پروفیسر واصل عثمانی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس مقالے کے کینوس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں:

"اس کے متعلق سماعی علم سے بہتر ہو گا کہ اس مقالے کا بذاتِ خود مطالعہ کر کے، پھر کوئی رائے قائم کی جائے کہ یہ انشائیہ ہے یا تنقید ہے۔ ادبی شہ پارہ ہے یا نعت کہنے اور لکھنے کے لیے ایک گائیڈ اور کلید ہے۔" (ص:۱۴۴)

مگر سچ یہ ہے کہ کشفی صاحب کی تنقید کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی بے حد ضرورت ہے یہ امر محض کشفی صاحب کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے لازم نہیں بلکہ نعتیہ ادب کو ایسے رموز سے مستفید کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جو ہماری ادبی روایت کے کُلی ادراک اور مرحلہ وار تجزیے کے بعد ان کے قلم سے بیان ہوئے ہیں۔ ایک صاحبِ ذوق اور ادب شناس ہونے کے ناطے کشفی صاحب کی نعت شناسی میں ایک توازن، نزاکت اور نرم خُوئی ہے جو وجہِ اضطراب ہونے کے بجائے آمادۂ تفکر کرتی ہے۔

کشفی صاحب نے بڑی شاعری کو چہار سمتی مکالمہ قرار دیا اور کہا کہ زبان کے خمیر میں یہ بات شامل ہے کہ ایک سے زیادہ جہتوں اور سطحوں کے مکالمے ایک ہی شعر یا شعری تخلیق میں آ جائیں۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنا مافی الضمیر "غزل میں نعت کی جلوہ گری"

میں اس طور سے بیان کیا کہ جب بھی شاعر محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے تو حمد و نعت کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ کشفی صاحب کے اس موقف پر حمایت اور مخالفت ہر دو طرح کی آرا سامنے آئیں مگر ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ کشفی صاحب کی رائے جسے انھوں نے مذکورہ بالا موقف پر منتج کیا۔ اس رائے کے سہارے کسی اور صداقت کی تلاش بھی ممکن ہے اور یقیناً اس راہ میں ہاتھ آنے والے نو بہ نو افکار کو ثمراتِ کشفی میں ہی شمار کیا جائے گا۔

تنقیداتِ کشفی کو اجاگر کرنا بھی اسلوب کی جامعیت اور تاثیر کا متقاضی ہے۔ محض ان کی شخصیت کی اوصاف شماری یا ان کے بیانات کے حوالے دے کر اس موثر سرمائے سے استفادے کی ترغیب دینا مشکل ہے۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید نے ابتدا میں کشفی صاحب کی شخصیت و فن کے حوالوں سے گفتگو کو بظاہر بڑی عمدگی سے چار حصوں میں بانٹ دیا ہے لیکن مجموعی طور پر مضمون کا غیر تنقیدی اسلوب مذکورہ نکات کی منظم پیشکش میں حائل رہا ہے۔ ادبی جائزے کے بجائے کشفی صاحب کی شخصیت کا عقیدت مندانہ اظہار تحریر پر غالب ہے۔ کشفی صاحب کی نعت میں شعریت کے عناصر کیونکر جلوہ گر ہیں نعت شناسی اور تنقیدی شعور ان کے تخلیقی مزاج سے کس طرح آمیز ہے اس کا تجزیہ کرنے کے بجائے کشفی صاحب کے اشعار کی مثالوں اور تنقیدی تبصروں کے اقتباسات ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ موضوع سے ہٹ کر توحید و رسالت کے حوالے سے طویل گفتگو ادبی تنقید پارے کو موثر نہیں رہنے دیتی۔ اگرچہ صرف کشفی صاحب کے حوالے دینا مضمون نگار کا فرض نہیں مگر یہ بھی نئے پڑھنے والوں کے لیے بہر حال تعارف کی ایک راہ ہے۔

پروفیسر اقبال جاوید صاحب کے پیش کردہ ان نمونوں کو دیکھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ کشفی صاحب کی نثر و نظم، روحِ معنوی کے اعتبار سے باہم ملی ہوئی ہے گویا وہ نثر تخلیق کریں یا شعر کہیں ان کے رشحاتِ قلم کا منبعِ فیض مشترک ہے۔ یہ ایک فنکار کی مستحکم، مربوط

اور تربیت یافتہ شخصیت کی دلیل ہے۔ ایسی ہی شخصیات میدانِ ادب میں دُور رس اثرات اور امکانات کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

''جناب کشفی نے اپنے مختصر مگر انتہائی معتبر نعتیہ مجموعے ''نسبت'' کے حرفِ آغاز کے طور پر جو چند سطور لکھ دی ہیں میرے خیال میں نعت کے بارے میں ان کی سوچ کا ہر زاویۂ فکر اور وجدان کا ہر رُخ، ان میں سمٹ گیا ہے، یوں سمجھیے کہ وہ نثر میں تغزل کے ایمائی انداز کے ساتھ بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔''

(ص:۳۶)

مگر کشفی صاحب کی اس ایمائیت کو آشکار کرنے کے بجائے اپنے ذاتی خیالات کی بھرمار میں ضم کر دیا گیا ہے۔ انھی خیالات کے بیان میں کہیں کہیں فاضل مضمون نگار کی صائب آرا بھی ضو دکھاتی ہیں:

''اس مبالغہ آفرینی کو حضور ﷺ پر کیسے منطبق کریں گے جن کی توصیف کے لیے شرائط و حدود ہیں۔۔۔ ورنہ تو شخصی قصائد کے دفتر موجود ہیں اور ان کا ہر مبالغہ آفریں شعر نعت ہو سکتا ہے، محدود سے لامحدود میں داخل ہونے والے اشعار میرے خیال میں آفاقی تو قرار دیے جا سکتے ہیں، نعت کے نہیں۔''(ص:۵۴)

مگر اس تنقیدی شعور کے باوجود وہ کشفی صاحب کے تنقیدی تصورات کو ایک جامع اور مبسوط صورت نہ دے سکے۔ پروفیسر صاحب کے بقول کشفی صاحب نے یہ نمازِ نیاز روحانی خلوص، فکری تقدس، علمی رسوخ اور شعری تغزل سے ادا کی ہے دراصل یہ تالیف اسی ضرورت و اہمیت کی نشاندہی کرتی ہے کہ افکار و احوالِ کشفی سے استفادہ کی ممکنہ صورتیں اجاگر ہوں۔ صبیح رحمانی کی اس اوّلین کاوش کا محرّک کشفی صاحب سے ان کی گہری عقیدت

ہے جس کا اظہار کشفی صاحب کی وفات کے بعد نعت رنگ (شمارہ:۱۰) کے اداریے سے ہوتا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ حضرت کے چلے جانے سے مجھ پر کھلا کہ یتیمی کس احساس کا نام ہے۔ دل کا کٹنا صرف محاورہ نہیں ہے بے سائبان ہونا صرف لفظ نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے احساسات کا ایک جہاں آباد ہے، حضرت کی شخصیت مجموعہ کمالات تھی، ادب، لسانیات، خاکہ نگاری، شاعری، نعت گوئی، تنقید، سیرت نگاری وہ کون سا شعبہ تھا۔ جہاں آپ نے اپنے کام سے ان مِٹ نقوش نہ چھوڑے ہوں لیکن میری نظر میں عشقِ رسول ﷺ ان کی شخصیت کا سب سے بڑا حوالہ تھا لوگ ان کی سیرت نگاری، نعت نگاری، نعت شناسی کے ساتھ ساتھ دیگر مذہبی تحریری سرمائے میں ان کا عشقِ رسول ﷺ تلاش کرنے میں مصروف رہیں گے مگر میرے سامنے ان کی زندگی کے تمام پہلو ہیں جو ان کے عشق کی زندہ گواہی ہیں۔" (ص:۱۱، ۱۲)

صبیح رحمانی کی مرتب کردہ یہ کتاب یقیناً نعتیہ ادب میں کشفی صاحب کے کردار کو اُجاگر کرنے کے لیے ایک سنگِ میل ثابت ہوگی۔ صبیح رحمانی کے بقول کشفی صاحب نے اس زمانے میں نعت گوئی پر پوری سنجیدگی، متانت اور ادبیت سے لکھا جب ایسے موضوعات پر لکھنا اپنی ادبی ساکھ کو داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ اس تحریر کا اختتام انھی کے الفاظ میں کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"کشفی صاحب کے ادبی شعور، تنقیدی اور تخلیقی اسلوب کے جمال کی نقاب کشائی اور ان کی تنقیدی و تخلیقی دانش کی قدر و قیمت کا تعین بہرحال راسخ العقیدہ، ادب شناسوں اور نعت کے خدمت گزاروں پر قرض ہے۔" (ص:۱۵)

ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعاتِ حمد و نعت

زیرِ نظر کتاب کا انتساب ساعتِ اوّل ہی میں قاری پر واضح کرتا ہے کہ فریقین نے حصارِ نعت میں جینے اور ابعادِ نعت کو فروغ دینے کے عزم کو کس خلوص سے ہدفِ نگاہ کیا، جس کی بازگشت ہر سنگِ میل پر ہنوز انھیں مہمیز کر رہی ہے۔ کتاب کے ابتدائیے میں مرتب نے بخوبی واضح کیا ہے کہ نقدِ نعت کو ذمہ دارانہ نہج عطا کرنا کیوں ضروری تھا۔ ادب میں اس رویے کے فقدان کی وجوہات کیا تھیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نصب العین کو اپنانا اُن حالات میں کس قدر دشوار تھا جب نعت کے ساتھ ''تنقید'' کا لفظ ادا کرنا بھی قابلِ گرفت امر تھا۔ اس سماجی اور ادبی فضا میں صبیح رحمانی نے صنفِ نعت کے ادبی و تنقیدی تشخص کے لیے جن ادبی ہستیوں کو اپنا ہم خیال پایا ان میں اوّلین نام ڈاکٹر عزیز احسن کا ہے۔ اُس زمانے کے اہم نعت نگاروں کی جانب سے مسالک کے درمیان مناقشوں کے خوف اور نعت نگاروں کی دل شکنی کے اندیشے ظاہر ہونے کے باوجود، مشترک ذہنی و فکری میلان کی بنیاد پر ان مجاہدینِ نعت کی پُرخلوص رفاقت اور بے لوث باہمی تعاون کی بدولت ''نعت رنگ'' کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اگرچہ فی زمانہ نعتیہ ادب کا منظر نامہ، نعت کے شاعر، ناقد اور محقق کو خاطر خواہ سامانِ تسکین فراہم کرتا ہے۔۔۔ جو بیشتر نعت رنگ کی تحریک ہی کی عطا ہیں۔ مگر جس مجموعی ماحول میں تمنا کا یہ بیج بویا گیا اس کے پیشِ نظر یہ کہنا بجا ہے کہ اس کا شجرِ ثمر بار میں تبدیل ہونا

کسی اعجاز سے کم نہیں۔

اس کتاب میں ڈاکٹر عزیز احسن کی تنقیدی تحاریر کو مجتمع کیا گیا ہے جن میں مقدمے، دیباچے، تقاریظ، مضامین، نعت رنگ میں شائع ہونے والے شخصی گوشوں پر تبصرے، اختصاریے اور کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ صنفِ نعت کے لیے ان کی تنقیدی بصیرت اور خیر خواہی ان تحاریر سے آشکار ہے۔ اہلِ علم نے بالخصوص وابستگانِ نعت نے برملا یہ اعتراف کیا ہے کہ ڈاکٹر عزیز احسن نے نعت کا تخلیقی مطالعہ اور نعت کا بطور صنف محاکمہ کیا ہے۔ ان کے بنائے ہوئے معیارات اور قواعد، اصول اور تحقیق پر مبنی ہیں۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کے تنقیدی شعور میں مزید پختگی آئی ہے مگر نعتیہ تنقید میں ان کے بیشتر اختصاصات اولیت کے حوالے سے ہمیشہ اہم رہیں گے۔ ابتدائیے میں اس پہلو کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر عزیز احسن نے دینی ادب کو خصوصاً مرکز بنایا اور سب سے زیادہ تنقیدی کتب پیش کی ہیں۔ مرتب نے ان کی تحریروں کو ایک جہت نما اضافہ قرار دیا ہے۔ صبیح رحمانی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعاتِ حمد و نعت'' میری خواہش اور تحریک پر شائع ہو رہی ہے۔ عزیز صاحب کو اس لوازمے کی اشاعت کے معاملے میں کچھ تردّد تھا۔ اصنافِ حمد و نعت کے حوالے سے تنقیدی ادب بھی تشکیلی دور سے گزر رہا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں جو حرف بھی تنقیدی بصیرت سے لکھا گیا ہے اسے کتابی صورت میں محفوظ ہو جانا چاہیے تاکہ ان اصناف پر بڑھتے ہوئے ذوقِ تنقید و تحقیق، تجزیہ و تبصرہ اور مطالعہ و مشاہدے کے زیادہ سے زیادہ رجحانات سامنے آسکیں۔ مجھے یقیں ہے کہ سنجیدگی سے لکھی گئی ایسی تحریریں آئندہ آنے والوں کی فکری راہوں کو منور کرنے میں معاون ثابت ہوں گی۔ مستقبل کے محققین و ناقدینِ فن ان تحریروں کی روشنی میں اپنا لائحۂ عمل مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ نقد و نظر کا منہاج بھی

متعین کر سکیں گے۔"(ص:۲۲)

ان مطالعاتِ حمد و نعت سے ڈاکٹر عزیز احسن کی شخصیت کا جو مستحکم پہلو سب سے پہلے اجاگر ہوتا ہے وہ ان کی زبان دانی، پختہ شعری ذوق اور ادبی روایت سے کماحقہٗ آگاہی ہے۔ شعر کی فصاحت و بلاغت کن اوصاف اور علوم سے مستنیر ہوتی ہے وہ اس کا خاطر خواہ مطالعہ اور شعری قرائن کے حسن و قبح کا علم رکھتے ہیں۔ مطالعے کی وسعت ہی کے باعث وہ لطیف و خفیف تلمیحی اشاروں کو بھی پا جاتے ہیں۔ تنقید تحریروں میں ان کے منتخب کردہ اشعار اعلیٰ ذوق کے عکاس ہیں شعر سے متاثر ہونے یا حظ اُٹھانے میں ان کا یہی ذوق رہنما ہے۔ ان کی ایک رائے ملاحظہ کیجیے:

"قادرالکلامی میں دماغی ریاضت کو دخل ہوتا ہے اس لیے ہر قادرالکلام شاعر دِل کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔"(ص:۲۴۸)

عمدہ ادبی ذوق اور ادب شناسی دو قریبی صفات ہیں، ایک کی موجودگی دوسری صفت کو تقویت دیتی ہے۔ ڈاکٹر عزیز احسن کی تنقیدی بصیرت بیک وقت قدیم و جدید معیارات و مآخذ سے مستفیض ہے پھر ان کی ذاتی ذہنی اپج ان کے تنقیدی اظہارات کو بلیغ تر بنا دیتی ہے۔ شعری تجزیے میں ان کے ہاں لفظوں کی معنوی اہمیت، وسعت اور محلِ استعمال پر توجہ بالخصوص مرکوز رہتی ہے۔ ان تناظرات میں کیا گیا تجزیہ صاحبِ کلام کے دائرۂ اظہار اور تخلیقی شعور کا پتہ دیتا ہے۔ الفاظ کیونکر تکرار یا تجنیس سے معنوی لطف کو وسیع کر دیتے ہیں بہتر اور موزوں ترین لفظ مضمون میں کس طرح جان ڈال دیتا ہے۔ یہ پہلو ان کی تجزیاتی تحریروں میں بارہا اجاگر ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عزیز احسن کی تنقیدی تحریروں میں خود اعتمادی نے ایک وقار پیدا کیا ہے۔ حمد و نعت کی بات کرتے ہوئے دیگر اصنافِ سخن بھی ان کے تنقیدی شعور کی زد سے باہر نہیں رہتیں بلکہ بحیثیت مجموعی ادب کے باطن میں موجود داخلی ربط کا انھیں بھرپور ادراک حاصل ہے۔ مضامینِ شعر کے ساتھ ساتھ انھیں جہاں کسی کلام میں ردیف نباہنے، ردیفی لفظ یا الفاظ

کے معنوی پیکر تراشنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے وہ اسے تجزیے کے ساتھ سراہتے ہیں۔ شعر کے مختلف النوع رنگ اور معنوی ابعاد کو اجالنے کی کوشش ان کے ہاں واضح ہے کیونکہ ان کے بقول:

"شاعری ایک پیچیدہ تخلیقی عمل ہے اس میں نظم ہونے والے افکار و خیالات کی حدیں متعین نہیں ہوتی ہیں یہ ہمہ علمی اور ہمہ آفاقی وسعتوں کو سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ شعر میں موزوں ہونے والے فکری ارتعاشات بھی وقت اور طرزِ قرأت بدلنے سے معانی کے نئے آفاق کی نشاندہی کرنے لگتے ہیں جو شعر کہتے ہوئے شاعر کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں ہوتے۔"

(ص:٦٧)

شاعری میں حسنِ بیان، بلاغت، ترنم اور نغمگی کو ہمیشہ قبولیت حاصل رہی ہے ان عناصر کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے فکری عناصر پر مفصل اور باحوالہ گفتگو کی ہے۔ تنقید کی طرف سنجیدہ رویے کی عکاسی ان کے بیانات سے جابجا ہوتی ہے۔ زیرِ بحث حمدیہ و نعتیہ کلام جن ہیئتوں میں کہا گیا ہو۔ ان کے متعلق فنی معلومات کو نہایت جامعیت اور اختصار سے انھوں نے پہلو بہ پہلو بیان کر دیا ہے۔ مشرقی و مغربی اصنافِ سخن پر ان کی رائے واضح اور متوازن ہے اور مختصر گفتگو میں بھی وہ ان اصناف کے محاسن یا اثر انگیزی کے عوامل پر قابلِ عمل رائے وضع کر دیتے ہیں مثلاً انھوں نے تضمین کو اصل شعر کے مافیہ اور زبان و بیان کی سطح سے اس طرح ہم آہنگی کو لازمی قرار دیا ہے جس طرح رفوگر اپنے دھاگوں کو کسی کپڑے کے تانے بانے میں اس طرح پیوست کر دیتا ہے کہ رفوگری کے عمل کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

"قدیم شعری متون کا معنیاتی سیل کس طرح جدید شعریات کو عصری حسیت اور مروجہ نسلی نظام سے مربوط کرتا ہے اس بات کی تفہیم تضمین کی قرأت سے ہو سکتی ہے۔" (ص:۱۲۷)

حمد نگاری کے حوالے سے جو تحریریں ان کے قلم سے زیبِ قرطاس ہوئیں ان میں قرآن و سنّت، اولیا و مفسرین کے حوالے، دیگر ادیان سے اسلامی تصورِ توحید کا تقابل، نیز مسلم معاشرے میں توحید کے ادراک کے زاویے شامل ہیں۔ انھوں نے یہ تجزیہ بھی کیا ہے کہ حمدیہ شاعری کی مختلف جہات کیونکر سامنے آتی ہیں۔ حمدیہ مضامین باندھنے کو شاعر کے لیے جو حزم و احتیاط لازم ہے۔ اس کا وہ بالقصد تواتر سے ذکر کرتے ہیں گویا یہ نکتہ ان کی شعوری ترجیحات میں سب سے مقدم ہے۔ ان کے تنقیدی جائزوں میں فہم القرآن کا جو ثبوت ملتا ہے وہ حمد و نعت کے ناقد کی شرطِ اوّلین ہے۔

حمدیہ آہنگ کے کتنے ہی زاویے ڈاکٹر عزیز احسن کی تنقیدی آراء سے واضح ہو کر سامنے آتے ہیں حمدیہ کلام کے تجزیے میں انھوں نے یہ پہلو بھی سامنے رکھا ہے کہ شاعر کی بیدار مغزی اور فنی بصیرت شعر میں ایسا زاویہ ضرور پیدا کر دے کہ نعتیہ پہلو کے ادغام کے باوجود کلام حمدیہ پیکر میں ڈھل جائے۔ ان کے نزدیک شاعر کے اپنے ذہنی تصورات کا شفاف ہونا مقدّم ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”کسی شے یا ہستی کی تعریف و ثناء کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس شے یا اس ہستی کے بارے میں اتنا علم ضرور حاصل کر لے جتنی اس شے یا اس ہستی کے بارے میں بات کرنے کا ارادہ ہو۔“ (ص:۷۵)

حمدیہ شاعری میں مشاہدہ، عرفان اور فکری استعجاب کی کیفیات کا شعریت میں ڈھلنا لازم ہے اس کے بغیر تاثر کا پیدا ہونا محال ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک حمد کے شاعر کو اس بلند سطح پر فائز ہونا ضروری ہے کہ جہاں وہ اپنے فکر و تخیل کو صفات خداوندی سے ہمکنار کرنے کی کوشش میں بہترین شعری پیکر عطا کر دے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ حمد کا شاعر قرآنی متن کو بھی تخلیقی حسن کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالے۔ ان کی تحریر سے ایک اقتباس دیکھیے:

> ”اَن دیکھے ربّ کی ثنا کا مرحلہ مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے اور یہی

مشکلات خیال میں نزاکتیں اور بیان میں نیرنگیاں پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ بات ایک ہی کہنی ہو تو صرف زاویہ ٔنگاہ کا فرق اور لفظوں کے مختلف لونی عکس یعنی Shades بدلنے سے شعر میں تازگی اور اچھوتا پن پیدا ہو جاتا ہے بصورتِ دیگر شعر سادہ اور سپاٹ ہو جاتا ہے اور قاری کے لیے اس شعر کی کشش محض اس کے مافیہ، متن یا Text اور Content کے حوالے سے تو ہوتی ہے لیکن شعریت کا فقدان موضوع کو بھی ہلکا کر دیتا ہے۔"(ص:۷۶)

ڈاکٹر عزیز احسن کی تحریروں کے بعض اجزا ان کی اپنی روحانی وارداتوں کے بھی غماز ہیں جو صوفی منش شعرا کے کلام پر رائے کے لیے سیاق و سباق کا کام دیتے ہیں۔ طبیعت کا یہی پہلو انھیں کبھی کبھی اپنی سوچ کے کسی زاویے پر تائیدِ غیبی کے اشارے بھی سمجھا دیتا ہے۔ وہ روحانی شخصیات کی شاعری میں فنی لوازم اور عروضی معاملات پر توجہ دینے کے بجائے کلام کی کیفیت اور حقیقت بیانی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک کائنات کی ہر شے میں خالق کی خلاّقیت کا عکس دیکھنا اور دکھانا، عبد و معبود کے رشتے کے حوالے سے اشعار میں احساس جاگزیں ہونا، خالق کی عنایات اور صفات کا ذکر حمدیہ شاعری کا لازمہ ہے۔ یہاں کامیابی کا انحصار کمیت پر ہے تخلیقی اور علمی بصیرت حمدیہ شاعری کے لیے ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شوقِ قافیہ پیمائی اور ندرتِ ردیف کی دھن میں کہے گئے غیر متوازن کلام کا بخوبی محاکمہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بہت سی حمدوں میں دین کے مسلّمہ حقائق کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے اللہ رب العزت کو (نعوذ باللہ) اطلاع فراہم کی جا رہی ہے۔"(ص:۲۳۳)

اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" سے یہ فرض نہیں کیا ہے کہ اللہ رب العزت کی ذات و صفات کے بیان میں معمولی بے احتیاطیاں جائز سمجھی جائیں۔

ڈاکٹر عزیز احسن کی ادبی حیثیات میں "نعت شناسی" سب سے اہم ہے۔ ان کے

نزدیک نعت شناس کو نعتیہ شاعری کے رموز و غوامض سے آگاہی کی خوبی اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور وہ اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ ان کے نزدیک نعت کے نقاد کے لیے متداول علوم سے آگاہی کے علاوہ دینی علوم اور فکرِ اسلامی کی تاریخ سے آگاہی اور گدازِ قلب لازم ہے۔ گویا وہ نعتیہ ادب سے علم اور تاثیر دونوں ہی اخذ کرتا ہے۔ اپنے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

> ''میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ نعتیہ شاعری میں پیغامِ صداقت، بیان کی سادگی اور حقائق کی تخلیقی نہج پر جلوہ گری دیکھ سکوں۔''(ص:۱۸۸)

یہی وجہ ہے کہ نعتیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے شعرا کے فکر و خیال کی تطہیر، لفظوں کے قوی استعمال اور خلوصِ فن کو اجاگر کیا ہے۔ جہاں انھیں شعری دانش، دینی بصیرت سے مستنیر نظر آتی ہے۔ وہاں وہ شاعر کی تخلیقی رَو کا حسن اپنے حسنِ انتقاد سے اور بھی واضح کر دیتے ہیں۔

ادبی تنقید میں ایک یہ رویہ بھی فروغ پاتا رہا ہے کہ ناقدین محض اپنی ذاتی افتادِ طبع کے تحت ''روایتی'' اور ''جدید'' شاعری کے انقسام کے بعد کسی ایک طبقے کی شاعری کو یکسر غیر اہم اور دوسری طرف کی شاعری کو ہر عیب سے پاک اور قابلِ اعتنا گردانتے میں سہولت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عزیز احسن نے شعرا کے اختیار کردہ شعری رویوں کو اپنے اپنے سیاق و سباق میں رکھ کر موضوعِ تنقید بنایا ہے۔ قلمکاروں کی دنیا میں یہ توازن بہتوں کو نصیب نہیں۔ ادب میں مستعمل رویوں میں سے کسی ایک کا داعی ہونے کی آزادی شاعر کو حاصل ہے۔ ناقد کا کام اسی کی روشنی میں جائزہ لینا ہے۔ تنقید میں متوازن اور غیر مبہم زاویہ ہائے فکر و نظر کے حوالے سے ان کا یہ بیان بھی قابلِ توجہ ہے:

> ''ایک خیال بار بار مجھے اپنے اظہار کی طرف مائل کرتا ہے۔ وہ یہ کہ تحقیقی مقالات اور تذکروں کو بھی تنقیدی کتب میں شمار کرنا چاہیے؟ اس میں شک نہیں کہ تحقیقی مقالات اور تذکرے بھی تنقیدی آرا سے مزین ہوتے ہیں لیکن ان کی نوعیت خالص تنقیدی نہیں ہوتی ضرورت اس بات کی ہے کہ

نعتیہ ادب میں بھی خالص تنقیدی کتب کا مطالعہ کیا جائے۔ دیگر کتب میں تنقیدی رجحانات کے اظہار کی جزوی کوششوں کو بھی سراہا جانا چاہیے لیکن موضوع کا اختلاط اس طور نہ ہو کہ تحقیق، تاریخ، تذکرہ اور تنقیدی کتب سب ایک ہی زمرے میں آجائیں۔" (ص:۱۱۴)

ڈاکٹر عزیز احسن نے نعتیہ کلام پر تنقید کرتے ہوئے جذبۂ عشقِ رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ اکتسابی علم، احساسِ لطیف اور شعر گوئی کی وہبی صلاحیت کو موثر نعت گوئی کے لیے ضرور قرار دیا ہے۔ نعتیہ تنقید کے متعلق ان کے یہ افکار تحریروں میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں:

"میں نعتیہ شاعری میں جذبے کی سچائی اور اسلوب میں ادبی شان کا متلاشی رہتا ہوں اور انہی اصولوں کو نعت کی تنقید میں اساسی اور کلیدی اہمیت دینے کا حامی ہوں۔۔۔ مناسب و موزوں حسیت یوں تو ہر قسم کی تخلیق کے لیے ضروری ہے لیکن نعت میں جس قدر درکار ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس صنف کی عظمتوں اور موضوع کی رفعتوں سے واقف ہیں۔"

(ص:۱۳۶)

ان کے نزدیک ایک نعت گو کے لیے ضروری ہے کہ شعر کی داخلی و خارجی جمالیاتی قدروں سے واقف ہو۔ احساسِ جمال کا مظہر ہو، نیز مسلسل فنی ارتقا کا حامل ہو۔ شاعر اپنی ذاتی صلاحیتوں کو جان کر اپنا سفری آدرش متعین کرے، قلب کی بیداری اور احساس کی شدت، خیال کی پاکیزگی اور اعلیٰ سنجیدگی اشعار سے جھلکتی ہو۔ خصوصاً آگہی کے اس دور میں نعت گو کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ صحتِ مضامین اور صحت فکر و عقائد کی گفتگو ان کی نظر میں ہمیشہ مقدّم رہی ہے۔ ان کی نگاہِ نکتہ شناس ایسے حوالوں کو بڑی سہولت سے چُن لیتی ہے اور ان کی صائب رائے کا موضوع بنا دیتی ہے۔ مثلاً علامہ شہزاد مجدّدی کے شعر میں شعورِ بندگی کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

میرا دُرُود اور ہے اس کا دُرُود اور
کیسے بھلا میں خود کو شریکِ خدا کہوں

''یہ شعر نعتیہ ادب میں جہت نما ہے اور ان شاء اللہ تازہ واردانِ بساطِ نعت کے لیے سمت نمائی کا روشن منارہ ثابت ہو گا۔''(ص:۹۱)

ڈاکٹر صاحب نے کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں میں اہم تر نکات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے اوراشعار کی جمالیاتی و معنیاتی خوبیاں ظاہر کرنے کو بہترین مثالیں اخذ کی ہیں۔ ان تجزیوں میں انھوں نے بالعموم شاعر کی ''کُلیت'' کو مدّ نظر رکھا ہے۔ شاعر کا فکری عمق، مضمون آفرینی اور تازہ پن ان کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ قافیے کی بُنت میں شاعر کی شخصیت اور فکری رجحانات کے پہلو تلاش کرنے میں کامیاب ہیں ردیف برتنے کا فن اپنی تمام تر اثرانگیزیوں کے ساتھ ان کی نگاہِ نکتہ بیں پر واضح ہے۔ ان کے نزدیک شعر ترسیلِ جذبات، ابلاغ پیغام اور انتقالِ کیفیت کا بہترین وسیلہ ہے۔ مشّاق شاعر اس وسیلے سے ادبی خوبیاں اور دینی صداقتیں سمونے پر قادر ہے ان تناظرات میں ڈاکٹر صاحب کے مختصر تعارفی اظہاریے نعتیہ شاعری کی اقدار کے آئینہ دار ہیں۔

اشعار میں موجود فنی اسقام کی نشاندہی، ان کی اصلاح کی راہ دکھانا، محلِ نظر الفاظ کے متبادل لفظ تجویز کرنا، بے جا تحسینی کلمات کے بجائے شعورِ فن کی طرف رہنمائی کرنا ان کے ذمہ دارانہ رویے اور خود اعتمادی کے عکاس ہیں۔ وہ شاعر سے بھی اسی خود اعتمادی اور ذمہ داری کی توقع کرتے ہیں:

''میرے نزدیک کسی بھی فنی کمال کو اپنی خوشبو پھیلانے کے لیے کسی مڈل مین یعنی نقاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔''(ص:۲۸۸)

نعتیہ ادب میں تجربات کے حامل شعرا کو لائقِ توجہ گردانتے ہوئے نعتیہ شاعری کے عصری رجحانات اور لہجوں کی تازگی ان تحریروں سے منعکس ہے ان کے نزدیک یہ جدت پسندی اور تازہ کاری نعتیہ شاعری کو بطور صنفِ ادب تسلیم کروانے کے لیے ناگزیر ہے وہ

سمجھتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں شعری اجتہادات کو نعت کے شعری اسالیب کے تنوع کی خاطر سراہنا چاہیے لہٰذا وہ اس بات کے حامی ہیں کہ شعری اقدار میں جدّت کا عنصر نمایاں ہو سوچ اور اظہار کے نئے آفاق مسخر کیے جائیں مفہوم کی بلندی، مقصد کی نشاندہی اور عقیدے کی سچائی شعر کی اکائی میں ڈھل جائے ایک ایک شعری پیکر معنیاتی وسعتوں کا حامل ہو اور اُمتِ محمدیہ کے اجتماعی لاشعور کا آئینہ دار بھی۔ تمام تر خارجی محاسن کے باوجود نعتیہ شاعری میں بنیادی طور پر وہ کس جوہر کو تلاش کرتے ہیں:

> ''حبِّ رسالت کا جوہر جس شاعر میں جتنا زیادہ ہوتا ہے اس کے حروف کی ظاہری کثافت لطافتِ فن میں ڈھلتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت گوئی کے مرحلے سے ہر شاعر کامیابی سے نہیں گزر پاتا۔'' (ص:۲۴۷)

نعتیہ مجموعوں پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ایسے کلام کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے جس میں شعر کا متن اور اسلوب قاری کے قلب و ذہن کو قبولیت اور عمل کی بھرپور ترغیب دے سکے۔ ایسے نعت گو شعرا جن کا فن ارتقا پذیر ہے ان کی کسی ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے شاعر کے سابقہ سرمائے کو بھی شاملِ سخن کیا ہے اور پھر اِس تناظر میں شاعر کی افزونی اور ارتقا پر بات کی ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ تبصرے بعض کتب کو دیکھنے کی خواہش اور ان کے مطالعے کی تحریک میں معاون ثابت ہوں۔

نعتیہ شاعری پر تنقید محض تحسین کا عمل نہیں دورِ حاضر میں صاحبانِ علم اس پہلو سے خاطر خواہ آگہی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عزیز احسن کا شمار نعتیہ تنقید کے ابتدائی علمبرداروں میں ہے مگر ابتدا ہی سے ان کی نظر محض فنی حوالوں پر ہی نہیں فکری و تصوراتی غلط فہمیوں پر بھی یکساں مرکوز ہے ان کی تحریروں میں نعت کے متعلق سنجیدہ، اصلاحی نقطۂ نظر ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔ لفظ ''کبریا'' کے استعمال۔ ''صلِ علیٰ'' کے استعمال کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے وہ اہم گفتگو فرمائی ہے جس کی توقع کسی تربیت یافتہ ذہن ہی سے کی جا سکتی ہے۔ غیر مستند روایات کو نعتیہ شاعری میں نظم کر دینا بھی ان کی تنقیدی دیانت کو گوارا نہیں۔ نعتیہ شاعری کو اغلاط

کی تکرار سے بچانے کے لیے انھوں نے جہاں ضروری سمجھا ہے ان اغلاط کی اصلاح ضرور کی ہے۔ بزرگانِ دین سے عقیدت میں غلو کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شخصیت پرستی، کاہلی اور بے عملی کا مشاہدہ ہمارے معاشرے میں عام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان عمل گریز رویوں کی نشاندہی کو اہل قلم کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر عزیز احسن کی یہ تحاریر محض شعری سرمائے تک محدود نہیں بلکہ تنقیدی و تحقیقی کتب پر ان کی آراء یکساں صیابت اور سنجیدگی کی حامل ہیں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایسی تصانیف میں تحقیق کی بنیاد علمی وسعت اور احتیاط پر ہو، تنقیدی جائزوں میں نکات یا امثلہ کی تکرار نہ ہو، موضوع کی متانت پیشِ نظر رہے۔ رسائل و جرائد کے مرتبین اور انتخاباتِ نعت کے تدوین کاروں کے لیے وسیع القلبی کا درس بھی ان کے ہاں موجود ہے علمی دنیا میں مسلکی اختلاف کے باعث معاندانہ رویوں کے اظہار کی انھوں نے مذمت کی ہے۔ مختلف عنوانات کی حامل تحریروں کا یہ مجموعہ داخلی طور پر چند مشترک اقدار سے پیوست ہے ہمارے ادب، سماج اور تہذیب کا تانا بانا انہی اقدار سے مربوط ہے۔ کتاب کی ابتدا میں صبیح رحمانی کی یہ رائے مبنی بر حق معلوم ہوتی ہے:

> ’’ان مطالعاتِ حمد و نعت سے یہ حقیقت بھی روشن ہو رہی ہے کہ یہ مقدس اصناف اب نہ صرف ہمارے ادبی ماحول کو متاثر کر رہی ہیں بلکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ تہذیبی فضا کا حصہ بھی بن چکی ہیں۔‘‘

اُردو حمد کی شعری روایت

حمد نگاری اردو کی قدیم ترین شعری صنف ہے جس کی موضوعاتی وسعت دلیل کی محتاج نہیں۔ ہر مذہب کے ماننے والوں میں تصورِ الٰہ فکر و اظہار کا بنیادی عامل رہا ہے۔ اپنے خالق کی معرفت انسانی شعور کا تقاضا ہے۔ صبیح رحمانی کے بقول:

> ”اپنے خالق کی پہچان اور اس سے اپنے رشتے کا اظہار دراصل انسانی روح کا وہ داعیہ ہے کہ جو ایک طرف اس کے لیے کائنات میں درماندگی یا گم شدگی کا سدّباب کرتا ہے اور دوسری طرف اسے ازلی و ابدی، اصل اور ہمہ گیر حقیقت سے مربوط کرکے اس کی زندگی کو مقصد و معنیٰ عطا کرتا ہے۔“
>
> (ص:۱۲)

لہٰذا صبیح رحمانی نے اُردو شاعری کے آغاز سے لے کر عصرِ حاضر تک حمد نگاری کے منظر نامے کو نمایاں خدوخال کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ حمد کے تصور، حمد کی روایت، تاریخ و ارتقا، موضوعاتی پھیلاؤ اور فکری و فنی تناظرات کی حامل تحریروں کو یکجا کیا ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی نمونوں میں صوفیا کی حمد نگاری سے لے کر عہد بہ عہد ارتقا پاتی ہوئی یہ صنفِ جمیل خالقِ کائنات کی موجودگی، ہمیشگی اور ارفعیت کو انسانی شعور اور فن کے

عصری معیارات کی آمیزش سے زیبِ قرطاس کرتی آئی ہے کبھی عوامی سطح اور کبھی بلند فکری سطح سے ہمکناری اس صنف کے ادبی جائزے سے سامنے آتی ہے۔ کلاسیکی عہد میں حمد نے ہیئت کا تنوع پایا تو جدید دور میں فکری موشگافیوں نے اسے تاریخ ادب میں موجزن تمام تحریکات و نظریات کی آئینہ دار بنا دیا۔ صبیح رحمانی لکھتے ہیں:

> ''کسی تہذیب کے نظام فکر و حیات میں کام کرنے والے ہر بڑے تصوّر کی بنیاد در حقیقت اس تصورِ الٰہ پر ہوتی ہے یہ تصوّر جتنا بڑا، عمیق اور ہمہ گیر ہوگا اسی قدر اس تہذیب کے اوضاع میں وسعت، گہرائی اور جمالیاتی مظاہر میں جاذبیت کا عنصر زیادہ ہوگا۔''(ص:۱۵)

اسلامی تہذیب اور حمد نگاری کے بیچ یہ قدر کس طور مربوط رہی ہے اس کا اندازہ حمد نگاری پر نقد و نظر کا مرہونِ منت ہے۔ لہٰذا حمد نگاری کی تنقید کا بہتر مطالعہ مرتب کرنے اور اس کتاب کو بنیادی دستاویز کا درجہ دینے کی کوشش مرتب کے پیشِ نظر رہی ہے۔

کتاب کے مقدمے کا ایک وقیع پہلو حمدیہ ادب کے حوالے سے رسائل و جرائد اور مقالہ جات کا ذکر ہے جو وضاحتی کتابیات کا کام دیتا ہے۔ ان مآخذ کی قدر و قیمت بتائے ہوئے وہ بڑی جامعیت سے ہر تصنیف کے بنیادی وصف کو سامنے لائے ہیں۔ اس تخلیقی و تنقیدی سرمائے کی فہرست کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اردو ادب میں حمد نگاری کی صنف کو ادبی، فکری اور فنی تناظر میں وسیع تر تنقیدی معیارات کے تحت پرکھنے کا رجحان صراحتاً نہ اُبھر سکا۔ مگر صبیح رحمانی نے بجا طور پر صنفِ نعت کی اجاگری کے لیے کی جانے والی کاوشوں کا رُخ حمد نگاری کی طرف بھی موڑ دیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب سے ہی ان کی یہ ذہنی تحریک مدھم نہ ہوئی بلکہ ''حمدیہ ادب کا اجمالی مطالعہ'' کے عنوان سے وہ محققین اور ناقدین کے لیے مذکورہ مآخذ میں خاطر خواہ اضافہ کر چکے ہیں یہ کام اپنی جگہ وسعت اور استنادی شان کا مظہر ہے لہٰذا ڈاکٹر عزیز احسن لکھتے ہیں:

”محققین اور سکالرز کے لیے جتنا لوازمہ (Mattor) اس کتابچے میں مہیا کر دیا گیا ہے وہ تا حال، اس موضوع سے متعلق ضخیم تصانیف میں بھی نہیں ملتا ہے۔“ (اُردو کا حمدیہ ادب، ص:٦)

”اردو حمد کی شعری روایت“ میں شامل مضامین اردو نقد و ادب کی روایت کے مختلف مراحل سے مربوط ذہنوں کی عطا ہیں یہ نکتہ بجائے خود ادبی روایت کے ہر موڑ پر حمد نگاری کی اہمیت اور جاذبیت کا شاہد ہے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا نے قرآن و حدیث کے آئینے میں حمد کی معنوی اور موضوعاتی وسعتوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے یہ وہ صنفِ سخن ہے کہ اس کا دائرۂ کار بہر صورت قرآن و حدیث کے آئینے ہی میں متعین ہو گا۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی میں جا بجا اللہ کی تمام جہانوں سے ماورائیت، انسانیت پر اس کے احسانات، ذکرِ الٰہی، حمد و ثنا اور شکر گزاری کے فضائل کا ذکر حمد نگاری کی جہات واضح کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا لکھتے ہیں:

”قرآن حکیم میں حمدِ خداوندی کے ایسے نظائر، براہین، دلائل اور شواہد نظر آتے ہیں کہ انسانی ذہن، حواس اور فکر و نظر کی تمام تر بلندیاں ان کے احاطے میں گم ہو جاتی ہیں۔ ایک ایک سورت حمد خداوندی کی جلوہ گری کی مظہر ہے۔“ (ص:٦١)

حمد و مناجات کی دینی و ادبی قدر و قیمت کے مابین حدِّ فاصل کھینچنا ممکن نہیں۔ اللہ کی تعریف بیان کرنے میں دین جس خلوص، ایمان و ایقان، حقیقی و مستحکم قلبی و روحانی تعلق کا تقاضا کرتا ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی حمد نگاری کے مقتضیات یہی ہیں۔ حمد نگاری کا ایک پہلو دعا و مناجات ہے۔ یہاں بھی دینی و ادبی معاملہ مشترک ہے رسولِ کریم ﷺ نے اللہ کے حضور دعا و مناجات کا جو صادق و مخلص عمل انسانیت کو سکھایا۔ ادب میں بھی دعا و مناجات کی اثر انگیزی اسی سرچشمۂ فیض سے پھوٹتی ہے۔ مولانا سیّد ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

”حدیث وسیرت کے دفتر میں آنحضرت ﷺ کی جو دعائیں منقول ہیں، ان پر نظر ڈالیے، کیا کوئی بڑے سے بڑا ادیب اپنی بے بسی و کمزوری کا نقشہ کھینچنے کے لیے اپنا فقر و احتیاج بیان کرنے کے لیے اور دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لیے اس سے زیادہ موثر، اس سے زیادہ دلآویز اور اس سے زیادہ جامع الفاظ لا سکتا ہے؟“(ص:۸۵)

دورِ فترت کے شعرا کے حمدیہ اشعار میں تخلیقی فکر، مستحکم عقیدۂ توحید اور قدرتِ الٰہی کے نشانات کا ذکر کرنے کے بعد رشید وارثی نے آغازِ اسلام کے بعد دورِ رسالت میں اور خلافتِ راشدہ کے دور میں حمدیہ شاعری کی موجودگی اور کمی کا تجزیہ چند اہم سوالات کی روشنی میں کیا ہے۔ یہ ذکر بھی کیا گیا کہ شاعرانِ رسول ﷺ نے آپ ﷺ کے حکم پر مشرکین کی ہجو گوئی کا جواب دیا تو نعتیہ شاعری باقاعدہ رائج ہوگئی۔ اس شاعری میں اللہ کی حمد کے پہلو بھی مدغم ہوتے تھے۔ مصنف کے تجزیے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ زمانہ تبلیغِ توحیدِ الٰہی کا زمانہ تھا، دعوتِ توحید دینے میں حمدِ الٰہی ہی مضمر تھی گویا نعتیہ شاعری کا محرّک ایک سماجی عامل کو قرار دیا جارہا ہے جبکہ تبلیغ کا عمل بجائے خود حمدِ الٰہی کا عمل تھا اور مشرکین نے شاعری میں اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کی جرأت بھی نہ کی تھی اس لیے الگ سے یہ تفویض کرنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ نیز خلافتِ راشدہ کے دورِ آخر میں حمدیہ شاعری کے نقوش تلاش کرنے اور بعد کے ادوار میں تصوف کے رموز، فلسفیانہ موشگافیوں کے حمدیہ کلام میں جگہ پانے کے محرکات کا انھوں نے عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ حمد نگاری میں تفکر بالآیاتِ حق کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک حمد کے موضوعات بے شمار ہیں جن کی اساس شُکر ہے۔ عصرِ حاضر میں حمد نگاری کی ضرورت و اہمیت اور تقاضے کیا ہیں اس پر انسان کے سماجی ارتقا کی روشنی میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ عہدِ جدید کے عقلی تقاضوں کے تحت، قرآن کریم

کی روشنی میں سائنسی ارتقاء کی تفہیم لازم ہے یہ امر حمد نگاری کو تشکیک و الحاد کے خاتم کا کردار عطا کر سکتا ہے۔ رشید وارثی لکھتے ہیں:

''مسلمان محققین اپنی ان تحقیقی کاوشوں سے ملّتِ اسلام کو ایسا مواد فراہم کریں جس کے مطالعے سے افرادِ ملت کے قلوب کو اطمینان و اعتماد نصیب ہو اور ان کے افکار عصری تخلیقی شاہ کاروں میں ڈھل کر ایک نئے محققانہ انداز سے مشاہدات کی اساس پر حمدِ باری تعالیٰ کے لیے محرک ثابت ہوں۔''

(ص:۱۲۶)

انسان کی اللہ کے حضور شکر گزاری؛ قلبی و روحانی بصیرت شعورِ بندگی اور انفس و آفاق پر غور و فکر کرنا، یہ سب حمد نگاری کے لوازم ہیں۔ حمد کی تاریخ کو قدیم مصری ادب میں تلاش کیا گیا ہر چند کہ خدا یا معبود کا تصور انسان کے قلب و ذہن میں ہمیشہ رہا ہے۔ ہر دور میں ہر تہذیب میں اپنے خدا کی تعریف کا عنصر کار فرما رہا ہے مگر لفظ ''حمد'' جس کا ماخذ قرآن ہے اس کا اطلاق صرف ''اللہ'' کی تعریف پر ہونا چاہیے یہاں مصری ادب کا تذکرہ کرتے ہوئے 'نیل کی حمد' آفتابِ شام کی حمد، کے عنوانات قابلِ غور ہیں ''الحمدللہ'' کہہ کر ربِّ کریم نے خود حمد کو اللہ کے لیے مختص فرمایا۔ قدیم ترین ادب میں خدا کے غیر مادّی، غیر مرئی تصور کے باوجود اس وقت کہی گئی مدحیہ شاعری ''اللہ'' کے لیے نہ تھی۔ ان کے تصورات اسلامی تصورِ الٰہ کے ہم پایہ نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا ''حمد نگاری'' کی اصطلاح اسی شاعری کو زیبا ہے جو بالخصوص اللہ کی تعریف پر مبنی ہے۔ اللہ کی ذات وصفات کو موضوع بناتی ہے۔

انسانی تاریخ اور آیاتِ قرآنی سے حمد کے آثار و نقوش اجاگر کرنے کے بعد بالخصوص اردو حمد نگاری کو موضوعاتی، ہیئتی اور تہذیبی حوالوں سے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ عربی اور فارسی کی شعری روایت کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی ابتدا ہی سے حمد گوئی کے نمونے موجود ہیں۔ صوفیائے کرام، جو اُردو کی ابتدائی تشکیل کا موجب ہیں انھوں

نے تصوف و اخلاق کے پرچار میں حمد کے خالص اشعار کہے۔ یہ سلسلہ آنے والے ادوار میں جاری رہا اور ہر عہد کے چند نمائندہ شعرا کے کلام کا جائزہ ہی اس کے مطالعے کو کافی ہے۔ ہر ادبی رجحان اور ہر شاعر کے ذاتی میلانِ طبع نے حمد گوئی کی روایت کو رنگارنگی اور تنوع عطا کیا۔ یہ تنوع بیک وقت ہیئت، موضوع اور اسالیب میں موجزن ہے ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری نے حمدیہ شاعری کو شرعی، فلسفیانہ اور متصوفانہ حمد میں تقسیم کیا ہے، اور پھر ان کو مزید ذیلی سرخیوں میں تقسیم کیا ہے اس طور متعین خطوط حمد کے مطالعے میں بے حد معاون ہیں۔

ابتدائی اردو ادب میں جہاں روایتاً ہمہ قسم کے موضوعات اور قصص کے بیان سے پہلے حمد کا آغاز کرنے کا دستور قائم تھا اس سلسلے میں پیش کردہ مثالوں سے ایک دلچسپ پہلو یُوں سامنے آتا ہے کہ مثنوی نگاروں یا مدح نگاروں نے آغاز کے حمدیہ اشعار اسی تناظر اور اسی مزاج میں کہے ہیں جو آگے چل کر اصل موضوع یا قصے سے جھلکتا ہے یوں ان حمدیہ اشعار کو قصے کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط نے اُردو میں حمدیہ شاعری کے تاریخ وارتقاء کا مبسوط جائزہ پیش کیا ہے جو ہر دور کے غالب شعری مزاج کے عوامل و محرکات کا مختصر تجزیہ کرنے کے بعد نمائندہ شعرا کی حمد گوئی پر مختصر تنقیدی رائے پر مشتمل ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی عصری حالات حمدیہ شاعری کا رُخ متعین کرتے ہیں کبھی کسی ایک شخصیت کا طاقتور تاثر موجودہ اور آئندہ رجحانات میں حلول کر جاتا ہے۔ اقبال کی شخصیت اس کی اہم مثال ہے۔ بلاشبہ اقبال کے ہاں تمام تر فلسفیانہ نظریات اور مابعد الطبیعی مسائل کے باوجود حمد نگاری کے سَوتے قرآنی تصورات سے پھوٹتے ہیں۔ ان کا تفکر دیگر نظریات اور استدلال کو بھی قوتِ ایمان کے تحت قرآن کے تصورِ الٰہ سے جوڑ دیتا ہے۔

زمانی ترتیب سے اُردو ادب کے مختلف ادوار کو کھنگالتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے مختلف شعرا کے حمدیہ کلام پر کماحقہٗ تبصرہ کیا ہے۔ حمد کے حوالے سے شعرا، ناقدین اور مؤلفین کی حالیہ سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ادبی ماحول پر مجموعی تاثر کے علاوہ نمائندہ

شعرا کے کلام پر مختصر تنقیدی اشارے حمد نگاری کے منظر نامے کو ذہن میں اجاگر کر دیتے ہیں۔ حمدیہ مجموعوں اور حمد پر تحقیقی و تنقیدی مطالعات کے متعلق معلومات یہاں مجتمع ہیں۔ حمد کی ہیئت اور موضوعات دونوں پر مضمون نگار کی نظر ہے۔ ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط کا یہ مقالہ ایک الگ تصنیف کے طور پر اشاعت کے لائق ہے۔

ہماری شعری روایت میں حمدیہ تخلیقات اس حد تک موجود ہیں کہ ہیئتی اصناف کے حوالے سے جداگانہ وسیع مطالعات سامنے لائے جاسکتے ہیں۔ ابتداً مثنوی کے آغاز میں حمد کی شمولیت اگرچہ رسماً ہے لیکن اشعار کی جذباتی صداقت اور خلوص میں کچھ کلام نہیں۔ جدید دور تک آتے آتے مثنوی میں حمد و مناجات کا اظہار تنوع پاتا رہا جس کی مثال حالی کی مناجاتِ بیوہ میں حمد و مناجات کے حصے سے دی گئی ہے۔

جیلانی کامران نے ادبی روایت کے طریقِ کار یعنی مقامِ آغاز میں حمد کے اظہار کو دیکھتے ہوئے بہت اہم نکات پیش کیے ہیں مثلاً یہ کہ کیا حمد کا تعلق محض نگارشات کی ابتدا ہی سے ہے؟ اور کیا اس تعلق کو نگارشات میں تلاش نہیں کیا جاسکتا؟ مذہبی شاعری کے مجموعوں سے ہٹ کر دیگر افسانوی ادب یا علمی کتب کے نفسِ مضمون کے ساتھ حمد کو کیسے جوڑا جاسکتا ہے؟ کیا حمد کی حیثیت محض روایت کی تھی یا اس کا کوئی گہرا مفہوم تھا؟ پھر لکھتے ہیں:

> ’’حقیقت یہ ہے کہ جب حمد کو ادبی یا علمی نگارش میں شامل کیا جاتا ہے تو حمد مکتوبی الفاظ کی مدد سے وجودِ حق کے موجود ہونے کی گواہی مرتب کرتی ہے۔ حمد شہادت فراہم کرتی ہے اور لکھنے والا ذاتِ حق کے ’’اناالموجود‘‘ کو تسلیم کرتا ہے اس طرح وہ جو کچھ لکھتا ہے خدا کے حضور میں لکھتا ہے اور ذاتِ حق کی موجودگی میں لکھتا ہے اور اس کا ہر لفظ ذمے دار تحریر کا مقام پاتا ہے۔ ایسے گہرے احساسِ الوہیت نے حمد کے ذریعے مسلمانوں کے ادب اور علم کو عبادت کا مقام دیا تھا۔‘‘ (ص:۳۵۸)

جیلانی کامران کے بقول حمد محض روایت نہیں ہے ایک واردات ہے جس کا تخلیقی عمل کے ساتھ گہرا تعلق ہے لیکن جیلانی کامران کی اس تحریر کے اختصار نے، انتہائی فکر انگیز تجزیے پر مبنی ہونے کے باوجود، تشنگی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ ان کے پیش کردہ نکات حمد کی روایت کو از سرِ نو، بہ اندازِ دگر جانچنے کے لیے ایک صیابت اور ذہنی توازن عطا کرتے ہیں۔ یہاں مرتبِ کتاب کے اس مطمعِ نظر کی بازگشت ملتی ہے کہ صنفِ حمد کے لیے نگاہِ نقد و نظر پر متنوع زاویے ان تحاریر کے ذریعے اجاگر ہو جائیں۔

ڈاکٹر عزیز احسن نے حمدیہ شاعری کی متنی وسعتوں کو موضوع بنایا ہے۔ توحیدِ باری تعالیٰ کی تفہیم کے انداز میں، شریعت و طریقت میں موجود فکری تفاوت اور شعری اظہار پر ان کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ انسان اور کائنات کے غیر یکساں، متغیر ضمیر کے باعث تمام شعبہ ہائے زندگی میں رونما ہونے والے اثرات ادب کی ہر صنف کی طرح حمد نگاری میں بھی دخیل ہیں۔ موصوف نے حمدیہ شاعری میں دعا و مناجات، خالق کی عظمت کا اعتراف، جذباتِ تشکر مادّی اشیا کی تخلیق پر تفکر اور صوفیانہ جذب و سرشاری کے محرکات پر گفتگو کی ہے۔ اُردو کی ابتدائی چند حمدیہ تخلیقات کا اشارتاً ذکر کرنے کے بعد انھوں نے اقبال کی شاعری میں حمدیہ عناصر کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر عزیز احسن کے بقول:

> ''اقبال کے ہاں حمدیہ مضامین کا تنوع دیدنی ہے اور عبد کا اپنے معبود سے مکالمہ نئے انداز کا ہے۔ اقبال کی شاعری میں تصورِ الٰہ کی تفہیم فلسفیانہ سطح پر بھی ہوئی ہے اور ایمانیاتی نہج پر بھی لیکن ان کی تفہیم میں بنیادی عنصر عشق کا ہے جو سب تفہیمات پر غالب ہے۔'' (ص: ۳۷۲)

مزید لکھتے ہیں:

> ''ان کے بعد شعری اسالیب میں جو تبدیلیاں آئیں اور شاعری میں بالخصوص نظم گوئی میں جو فکری رَو داخل ہوئی اس کے اثرات آج کی حمدیہ شاعری پر

پڑے اور ان اثرات کی وجہ سے حمدیہ شاعری بھی شعری جمالیات سے قریب تر ہو گئی اور اس شاعری میں صرف مافیہ، مواد یا متن (Text) ہی لائقِ توجہ نہ رہا بلکہ اسلوبِ بیاں بھی مرکزِ نگاہ بننے لگا۔" (ص:۳۷۲)

اس کے بعد ناصر کاظمی کے حمدیہ آہنگ میں کارفرما تخلیقی توانائی اور دلکش اسلوب کو سراہا ہے۔ اجتماعی ادبی فضا اور شعور کے ارتقا نے حمدیہ شاعری پر جو اثرات مرتب کیے۔ مختلف شعرا کے حوالے سے، اس کا تجزیہ مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جدید حمد نگاری میں وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق سوالات اور شعرا کی استفہامی خود کلامی کے جوابات شعری تخلیقات میں فکری تجربات کا انعکاس کر رہے ہیں۔ جن کا انجام یقین کی کیفیات پر ہوتا ہے۔ شاعر قاری کو اپنے ذہنی و فکری سفر میں اسلوب کی دلپذیری سے شامل رکھتا ہے۔ ذاتی احساسات کا بلا تکلف اظہار "نازِ عبودیت" کا اظہار، ہندو صنمیات کی جھلک، تصوف کی روایت کا احیا، مذہبی تقدس کے بجائے شعری جمالیات کی باز آفرینی، تخیل کی آزادی اور جذبہ پرستی جدید حمد نگاری میں کیونکر جاگزیں ہے۔ ان عوامل کا انھوں نے باسہولت تجزیہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آج پوری دنیا میں جو خوف و ہراس کا عذاب آیا ہوا ہے اور دانشِ حاضر نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے۔ اس کا اثر ادب میں مختلف قسم کے رجحانات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ حمدیہ شاعری میں جو تصورِ الٰہ اُبھرا ہے۔ اس میں بھی رومانیت کے عناصر صاف دیکھے جا سکتے ہیں ان عناصر کو ملائیت قبول کرے یا نہ کرے۔ تصوف کی روایت سے آگاہ اور شعر کی داخلیت کے پرستار اس رجحان کو ضرور سراہیں گے۔" (ص:۳۸۷)

ڈاکٹر ریاض مجید نے موضوعاتی پھیلاؤ کے حوالے سے جزوی طور پر چند ساختیاتی معروضات پیش کیے ہیں۔ عربی و فارسی کی قدیم شاعری، اُردو کے ابتدائی حمدیہ نمونوں اور دورِ جدید میں حمد کے وسیع دائرۂ مضامین پر بات کی ہے۔ جس میں ہر عہدِ شاعری میں پیش کردہ تصورِ خالق، علوم سائنسی کی توضیح یا توسیع۔ نظامِ کائنات کے متعلق نت نئے انکشافات اور طرزِ ہائے اظہار کا تنوع کار فرما رہا ہے۔ صنفِ حمد نے قرآن کی متعین کردہ فکری و موضوعاتی حدود و قیود میں رہ کر شعری اظہار کی بو قلمونی اور فکری تلازمات کی جو عہد افزوں وسعت، گہرائی اور ندرت پائی ہے۔ یہاں اس کا عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس تجزیے میں حمد کا تخلیق کار اور حمد کا قاری دونوں پیشِ نظر ہیں:

> ''تصورِ الٰہی کے بیانیے اور حمد کی تخلیق میں ہر شاعر کا اک مختلف اور منفرد رجحان کار فرما ہوتا ہے اس طرح حمدیہ نگارشات اور ان کے قاری میں رابطہ بھی اس کی ذہنی استعداد اور حسیاتی کیفیات کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ تعلق جامد اور ٹھہرا ہوا نہیں ہوتا متحرک اور خیال افزوں ہوتا ہے۔ بچپن میں جب ہم ''خدا کی باتیں خدا ہی جانے'' جیسے مصرعے کسی سے سنتے اور پڑھتے تھے تو وہ محض الفاظ اور عقیدے کی تکرار لگتے تھے، اب ان الفاظ کو دہرانے سے خالق کی روزافزوں خلاقیت کے بارے میں سوچ بچار اور خیالات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔'' (ص:۴۰۹)

حمد سے متعلق لفظی و صنفی تناظرات پر بھی ان کی تحریر اہم ہے ابتداً تصورِ خدا اور تصورِ اللہ کے معنوی فرق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ''بلیغ اور پُر معانی'' نکات کو جمع کیا ہے۔ بطورِ صنف ''حمد'' کی بنیاد اسلام کے کامل تصورِ اللہ پر ہے اور اس کے مآخذ قرآن و حدیث ہیں۔ ہیئتی اعتبار سے حمد نگاری کا دامن متنوع جواہر پاروں سے مالا مال ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں:

''حمد کی صورت گری میں کم و بیش تمام موجودہ اصناف نے اپنا حصہ ڈالا ہے۔ ہر صنف کی صنفی اور ہیئتی خصوصیات حمد کی تزئین و تشکیل میں صرف ہوئی ہیں۔ غزل کے علائم و رموز قصیدے کا شکوہ، رباعی کا ایجاز، مثنوی کی روانی نیز اصنافِ سخن کے مشترکہ محاسن، تشبیہ، استعارہ، علامات و محاکات تمثیل کا انداز وغیرہ اوصاف، خواص اور خوبیاں صنفِ حمد کی تزئین و صورت گری میں کام آئی ہیں اور اسی طرح مستقبل میں کسی شعری صنف کے ظہور اور اس کے امکانی جوہر کے صنفِ حمد میں صرف ہونے کے دروازے بھی کھلے ہیں۔'' (ص:۴۳۱)

انہی امکانات کی بنیاد پر انھوں نے حمد کے صنفی تناظرات کے پھیلاؤ کے لیے اربابِ نقد و نظر سے ایک ''تحریک انداز جدوجہد'' کی توقع ظاہر کی ہے۔ حمد کی شعریات کا مسئلہ ادبی تنقید کے حوالے سے اہم ترین مسئلہ ہے۔ یہ مبنی بر علم و صداقت ہونے کے باوجود جمالیاتی اظہار کا متقاضی ہے۔ شاعر کا فنی کمال نظریے یا عقیدے اور شعریت میں توازن قائم کرنا ہے وہ بھی اس ادا سے کہ جمالیات کا تاثر غالب رہے:

''یہاں اسلام سے ہم رشتہ متعدد تصورات جیسے تصوف، تفقہ، تجرد، تفلسف اور سب سے بڑھ کر مسلکی تصورات شعری اظہار میں سرایت کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ ہم تصوف، فلسفے اور دیگر علوم کے دقیق مسائل سے متعارف ہونے کے لیے تقدیسی شاعری کی تخلیق نہیں کرتے اور نہ اس مقصد کے لیے اسے سنتے اور پڑھتے ہیں۔ حمد و نعت تخلیق کرنے اور انھیں سننے پڑھنے کا اوّل و آخر مقصد روحانی جمالیاتی حظ کے سوا کچھ اور نہیں۔'' (ص:۴۲۱)

ڈاکٹر طارق ہاشمی نے بقول صبیح رحمانی "یہ بات دلیل اور حوالوں سے ثابت کی کہ خدا سے شکایت اور مجادلے کے مضامین بھی حمد کی روایت کا حصہ ہیں"۔۔۔ شکایت کی نفسیات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے نیز انبیائے کرام کے ہاں شکایت یا مجادلت کی روایت کے پیشِ نظر مصنف نے اللہ سے گلہ گزاری کے غیر روایتی اور منفرد اسلوب کو حمدیہ شاعری میں شمار کیا ہے اور یقیناً یہ اندازِ تنقید بھی غیر روایتی اور منفرد ہے۔ مزید یہ کہ روایتی حمد نگاری پر تنقید کی نسبت قدرے مشکل اور نازک ہے۔ غالب و اقبال کے ہاں عبد و معبود کے مابین اس ناز کا اظہار جس قرینے سے ہوتا ہے وہ ایک پختہ فکری اسلوب اور شعور و آگہی کا غماز ہے، عشق کی جو شوخی و بیباکی اس میں کارفرما ہے اسے بذریعہ تنقید کسی جواز کی حاجت نہیں۔

مگر جدید اردو نظم کے لہجے اور قرائن کو اس ذیل میں لانے کے لیے اچھی خاصی ردّ و قدح درکار ہے۔ خود مصنف نے جدید اردو نظم کے ذکر سے قبل جو تمہید پیش کی وہ اس مجبوری کی واضح عکاسی کر رہی ہے۔ مضمون کا اصل موضوع خدا سے گلہ گزاری ہے۔۔۔ جبکہ جدید نظموں سے پیش کردہ مثالوں میں روحانیت، اخلاق اور خیر کے اُٹھ جانے کا المیہ علامتی انداز میں بیان ہوا ہے۔ یہاں شاعر خدا سے مخاطب ہو کر شکایت نہیں کر رہا بلکہ اپنے ماحول کے بنجر پن پر وحشت کا شکار ہے۔ اگرچہ یہ حوالے بھی درج کیے گئے ہیں کہ جدید نظم میں خدا کی موت یا خدا کے انکار سے کیا مراد ہے۔۔۔ لیکن ان منظومات سے ظاہراً چھلکتی ہوئی تمام تر تلخی چکھ لینے کے بعد یہ حوالے محض عذرِ لنگ محسوس ہوتے ہیں۔ زیرِ بحث موضوع کے حوالے سے اللہ سے شکوہ کنائی کی عمدہ ترین مثال "شکوہ" میں نظر آتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اقبال کا اصل مطمعِ نظر "جواب شکوہ" کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ جدید شاعر کو "جواب شکوہ" کے نقطۂ نگاہ سے اکتساب کرنا چاہیے مذہب یا تصورِ الٰہ بہرحال ہر تہذیب کا اولین عنصر ہے جسے نظر انداز نہ کرنا اور ابہام سے مملونہ کرنا شاعر کے لیے ضروری ہے۔

کسی قاری سے یا مکمل عہد سے اس قدر توقع رکھنا کہ وہ اس سلسلے میں جدید شاعر کی علامتوں میں ملفوف و محجوب، مبہم تصورات کا بخوبی ادراک کر لے۔ مشکل سی بات ہے اگر ادبی ابلاغ کی یہی صورت جدید نظم گو کے نزدیک مثالی ہے تو اس صورت کے پنپنے کو ابھی اور انتظار کھینچنا ہو گا۔ یہاں جدید نظم میں پیش کردہ تصورات اسلامی تصورِ الٰہ سے منطبق معلوم نہیں ہوتے۔ شعرا کا تلخ اور طنزیہ انداز اس محبت اور ناز کا حامل نہیں جو ''شکوہ'' میں موجود ہے۔ شاعرات نے صنفی امتیازات کے حوالے سے جو حرفِ شکایت رقم کیا ہے وہ اس سماجی زوال کا مظہر ہے جو انسان نے اپنے ہاتھوں مول لیا ہے۔ مرد کو صنفی برتری کی اجازت خدا کی طرف سے نہیں دی گئی۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''غالب و اقبال سے لے کر معاصر شعرا تک مذکورہ منظومات میں تخلیقی رویے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ شاعر اپنے مسائل و مصائب کے حل کے لیے جس ذات کو اپنا ملجا و ماویٰ تسلیم کرتا ہے وہ خدا ہے اور وہ اسی سے مدد مانگتا ہے۔ ایسے عالم میں وہ فریاد بھی اسی کے حضور کرتا ہے اور خدا کی ودیعت کردہ صفت تخلیق کی بنا پر اسی سے مکالمہ کرتے ہوئے اپنا حرفِ شکایت بھی بھرپور اسلوب میں رقم کرتا ہے۔ شاعر خدا سے جس تہذیبی مقام سے مکالمہ کرتے ہوئے طرزِ ابراہیم اختیار کرتا ہے اور اپنے رنج و آلام کے لیے گلہ گزار ہوتا ہے تو ایسی کوئی فکری ممانعت نہیں ہے کہ اس نوع کی تخلیقات کو حمد قرار دیا جائے کہ یہ بھی اس ذات کی صفتِ عظیم ہے کہ وہ سامع الحاجات اور دافع البلیات ہے۔'' (ص:۴۵۲)

یہ رائے بالکل بجا سہی لیکن سابقہ مثالوں میں سبھی شعری رویے اس ذیل میں نہیں آتے۔

ان تحاریر میں اُردو میں حمد کے اسالیب کا جائزہ لیتے ہوئے لسانی خصائص کے ساتھ ساتھ استفہامی، مکالماتی، استدلالی انداز کے حامل اسالیب اور حمدیہ شاعری میں تلمیحات یا تکرارِ لفظی اور دیگر صنائع بدائع سے ظہور پذیر جمالیات کا مختصر جائزہ آئندہ وقت میں نمائندہ شعر کے تفصیلی مطالعے کی بنیاد بن سکتا ہے جو حمدیہ ادب کی اہم ضرورت ہے۔

کاشف عرفان نے آزاد حمدیہ نظموں کا ساختیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ حمد کی آزاد نظم فارمیٹ نے جس طرح نظم کو بین العلومیت اور جدید حسیت کی حامل جدّتوں سے روشناس کر دیا ہے۔ نیز آزاد حمدیہ نظمیں آفاقی ادب کی جن خصوصیات کا پتہ دیتی ہیں۔ مصنف نے ان کا جائزہ لیا ہے۔ جدید حمدیہ شاعری میں کشف و آگہی کے مرحلے، سائنسی انکشافات کا قدرتِ الٰہی کے تناظر میں بیان، ادب، مذہب اور منطق کی ثلیث کو انھوں نے مدنظر رکھا ہے اور یہ تجزیہ کیا ہے کہ:

"مکمل حمدیہ آزاد نظموں کی نسبت عمومی آزاد نظموں میں موجود حمدیہ عناصر بڑے کائناتی سوالات اور اصول وضوابط پر بہتر روشنی ڈالتے ہیں۔"

(ص:۴۸۱)

صوفیانہ جذب و کیف، وقت کی اضافیت، بگ بینگ تھیوری کو جدید حمد گو شعرا نے آزاد نظم کی ہیئت میں فنی جاذبیت عطا کی ہے۔ کاشف عرفان کی یہ آرا ان کے سیر حاصل مطالعے کا ثمر ہیں:

"کائنات میں وقت ایک ایسا مظہر ہے جس نے کائنات میں موجود تمام اشیاو مظاہر کو اپنے جال میں پکڑ رکھا ہے اور یہ جال ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ وقت کی حقیقت کو کائنات کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش ہماری مذہبی حمدیہ شاعری کی بنیاد ہونی چاہیے۔"(ص:۴۸۸)

وہ یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ:

"اُردو میں حمدیہ آزاد نظموں میں مظاہر قدرت کو اس کی گہرائی میں جا کر سمجھنے اور پھر ربّ ذوالجلال سے عجز اور تشکر کا اظہار کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔"
(ص:۴۸۸)

کاشف عرفان نے برصغیر کی مذہبی ادبیات میں فکری منطق اور بین العلوی مطالعے کی کمی کی نشاندہی کی ہے۔۔۔ دیکھا جائے تو سماجی صورتحال کے وقت کے ساتھ تغیر پذیر ہونے سے ہر معاشرے کا ادب بھی تغیر آشنا ہوتا ہے۔ لہٰذا موجودہ عہد میں ظہور پذیر ہونے والے ادبی عناصر سے متعلق یہ آرزو کرنا کہ ماضی میں بہرصورت ان کی موجودگی ہونا چاہیے تھی۔۔۔ یہ محض سوال برائے سوال ہے۔ جو شاعر اطلاقی سائنس سے آشنا اور بین العلومی مطالعے کا حامل ہے۔ وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے گا۔ مگر دوسری طرف شعرا کا کسی علم سے نابلد ہونا کنارہ کشی کے معنوں میں نہیں لیا جاسکتا۔ ہر ذہن اپنی استعداد اور فطری میلان کے تحت علوم کے حصول کی کاوش کر سکتا ہے۔ شاعری کی بنیاد بہرحال جذبہ ہے یہ جذبہ اگر سائنس سے خاطر خواہ واقفیت "نہ رکھنے والے" شاعر میں موجود ہے تو اسے بھی اپنے دائرۂ فکر میں اظہار کی آزادی حاصل ہے۔ غالباً لاشعور میں اسی نکتے کی موجودگی کی بنا پر آگے چل کر وہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ کیا شاعری پر علم کا بوجھ ڈالنا چاہیے؟

ان کی یہ رائے بھی بالکل بجا ہے کہ "علوم اور شعریت" کے درمیان درست تناسب ہی کسی نظم کے آفاقی ہونے کی بنیاد بنتا ہے لیکن یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ "جذبہ اور شعریت" کا درست تناسب بھی عمدہ آفاقی شاعری کے امکانات رکھتا ہے۔

کاشف عرفان کے اندازِ تنقید میں فکر انگیز سوالات اُٹھانے کا عنصر ایک موثر عامل ہے۔ یقیناً ان کے پیش کردہ سوالات حمدیہ ادب کے بہترین جائزے کی بنیاد بن سکتے ہیں مگر آزاد نظموں کی اوصاف شماری سے قبل موصوف نے ابتدائی تجزیے میں قصیدہ، مثنوی، واسوخت، شہر آشوب اور غزل کے متعلق لکھا ہے کہ ان اصناف میں زندگی کے بعض رویوں

اور جذبوں کی کیفیات کا بیان نہیں ہو پاتا۔۔۔ جبکہ اردو ادب میں جدید اصناف کے پروان چڑھنے کے دیگر کئی اسباب لائقِ اعتنا ہیں۔ ان ہیئتی اصناف کی بے بضاعتی اس کی واحد دلیل نہیں۔ امتدادِ زمانہ کا بخشا ہوا ذہنی انتشار بھی طبائع میں قواعدِ مروّجہ سے بیزاری کا باعث ہوا ہے۔ بلاشبہ آزاد نظم میں بڑے موضوعات کو سمیٹنے کی جگہ موجود ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اساتذۂ فن نے غزل میں سہل ممتنع کے یادگار نمونے چھوڑے ہیں آزاد حمدیہ نظموں میں مابعد الطبیعاتی، ماورائی احساسات کا بیان خوب ہوا ہے یہ درست، مگر اسے ''پہلی بار'' قرار دیتے ہوئے غالب و اقبال کے شعری فکر و تفلسف کو بھلانا درست نہیں۔ بڑے موضوعات اور فلسفیانہ مسائل کو سمیٹنے کے حوالے سے بھی غالب و اقبال کی مثنویوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

خان حسنین عاقب نے بعض شعرا کے ایک آدھ شعر کے حوالے سے حمدیہ اسلوب پر گفتگو کی ہے۔ مگر حمدیہ ادب عصری اور تہذیبی سیاق و سباق میں تفصیلی مطالعے کا متقاضی ہے۔ باقاعدہ حمدیہ شاعری کے علاوہ اُردو غزل میں حمدیہ مضامین جس طرح تخلیقی شعور کے ساتھ آمیز ہوئے ہیں، آنے والے وقت میں سنجیدہ خطوط پر اس مطالعے سے دلپذیر ادبی و تنقیدی انکشافات ممکن ہوں گے۔

صبیح رحمانی نے اس تالیف سے حمدیہ ادب کے مطالعے اور محاکمے کی جس تحریک کو اُبھارا ہے، گزرتے وقت کے ساتھ یہ تحریک وسیع تناظرات کو سامنے لائے گی۔ حمدیہ شاعری کی فکری و فنی بوقلمونی کو کماحقہٗ سمیٹ لینے کو اعلیٰ اذہان اور بیک وقت بلندی و گہرائی کی حامل فکر درکار ہے۔ محض سرسری ذوق اس روایت کا جائزہ نہیں لے سکتا جو خالق اور بندے کے اس تعلق پر استوار ہے جس کی عمر یومِ الست سے تا ابد ہے۔

اشاریہ تالیفات

۱۔ نعت نگر کا باسی، نعت ریسرچ سنٹر، ۲۰۰۸ء

۱۔ نعت نگر کا باسی — سیّد صبیح الدین رحمانی

۲۔ نعت اور آدابِ نعت گوئی افاداتِ کشفی کی روشنی میں۔ پروفیسر محمد اقبال جاید

۳۔ ڈاکٹر ابو الخیر کشفی کی نعت شناسی — پروفیسر شفقت رضوی

۴۔ نسبت احساس اور لطافت کا مرقع — عزیز احسن

۵۔ ڈاکٹر ابو الخیر کشفی نعت کے جگنوؤں کے تعاقب میں — پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

۶۔ نسبت ایک جائزہ — ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی

۷۔ ایک صاحب الرائے نعت شناس — ڈاکٹر شبیر احمد قادری

۸۔ نعت اور تنقید نعت ایک جائزہ — پروفیسر واصل عثمانی

۹۔ نعت اور تنقید نعت — ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

۱۰۔ نذر ابو الخیر کشفی — جعفر بلوچ

۲۔ اُردو نعت میں تجلیاتِ سیرت نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، اپریل ۲۰۱۵ء

- اُردو نعت میں تجلیات سیرت — صبیح رحمانی

- تاثرات ــــ ڈاکٹر نثار احمد
- تاثرات ــــ ڈاکٹر عزیز احسن

۱۔ ظہورِ قدسی: پس منظر (اُردو نعت کے آئینے میں) پروفیسر محمد اقبال جاوید

۲۔ ظہور قدسی (اُردو نعت کے آئینے میں) پروفیسر محمد اقبال جاوید

۳۔ اُردو نعت میں بیانِ سیرت ــــ اصغر حسین نظیر لدھیانوی

۴۔ اسوۂ حسنہ (اُردو نعت کے آئینے میں) پروفیسر محمد اقبال جاوید

۵۔ سیرتِ مصطفیٰ کی بہارِ جاوداں (اُردو نعت کے آئینے میں) پروفیسر محمد اکرم رضا

۶۔ جمال محسنِ انسانیت: نعت کے آئینے میں ــــ گوہر ملسیانی

۷۔ اخلاقِ محسنِ انسانیتؐ، نعت کے آئینے میں ــــ گوہر ملسیانی

۸۔ رحمت وشفقتِ محسنِ انسانیت، نعت کے آئینے میں ــــ گوہر ملسیانی

۳۔ ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد و نعت نعت ریسرچ سنٹر، کراچی اکتوبر ۲۰۱۵ء

- مقدمے، دیباچے، تقاریظ، مضامین ــــ ڈاکٹر عزیز احسن

۱۔ عرفان ربِ کائنات ــــ سجاد سخن کا حمدیہ آہنگ اور رب العزت

۲۔ حمد و ثناء کی گونج ــــ سراج الدین سراج

۳۔ شعری تخلیقات یا آئینۂ حال ــــ ''تحیت'' کی شعری اقدار پر ایک نظر

۴۔ کلامِ ریاض الدین سہروردی کے معنوی العباد

۵۔ نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش

۶۔ تاثرات (اُردو نعت اور تجلیاتِ سیرت)

۷۔ نعتیہ شاعری میں اصنافِ سخن کی جلوہ سامانیاں

۸۔ ”بہشتِ تضامین“ پر ایک طائرانہ نظر

۹۔ ”متاعِ نور“ پر ایک نظر

۱۰۔ نعت میں زندگی کی حرارت اور عصری حسّیت

۱۱۔ گفتگو ضروری ہے (خوابوں میں سنہری جالی ہے)

۱۲۔ سچائی کا شعری اظہار (مہکتے حرف)

۱۳۔ ”قوسین“ پر ایک نظر

۱۴۔ زم زم عشق

۱۵۔ حدیث دل مہجوراں

۱۶۔ شاہ انصار الٰہ آبادی کی نعتیہ شاعری، کیفِ حضور کی شاعری

۱۷۔ عزیز الدین خاکی کا فن نعت گوئی

۱۸۔ نظر لکھنوی ایک گمنام، قادر الکلام نعت گو

۱۹۔ ادیب رائے پوری اور نذرانۂ اشک

- نعت رنگ میں شائع ہونے والے خصوصی گوشوں پر تبصرے: ڈاکٹر عزیز احسن

۲۰۔ حمیرا راحت کی دو نظمیں

۲۱۔ سید ضیا الدین نعیم کے نعتیہ اظہاری زاویے

۲۲۔ انور شعور کا شعر عقیدت

- اختصاریے — ڈاکٹر عزیز احسن

۱۔ اذانِ دیر — اللہ کی سنت — نزول — صدائے روح

۲۔ خیر البشر ﷺ — آنکھ بنی کشکول

- کتابوں پر تبصرے — ڈاکٹر عزیز احسن

۱۔ اُردو میں حمد و مناجات از ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

۲۔ صدائے اللہ اکبر حریم ناز میں از طاہر سلطانی

۳۔ حمد و مناجات از منصور ملتانی

۴۔ خواتین کی حمدیہ شاعری از اجمل نقش بندی

۵۔ خطیب الامم از ریحانہ تبسم فاضل

۶۔ شعرائے امر تسر کی نعتیہ شاعری از محمد سلیم چوہدری

۷۔ طور سے حرا تک از افسر ماہ پوری

۸۔ عالم افروز از خالد شفیق

۹۔ قندیل راحت از احمد شہباز خاور

۱۰۔ لم یاتِ نظیرک فی نظر از عنبر بہرائچی

۱۱۔ چراغِ مدحت از اعجاز رحمانی

۱۲۔ اوصاف از جمیل ملک

۴۔غالب اور ثنائے خواجہ، ادارۂ یادر گارِ غالب، کراچی، ۲۰۱۶ء

- معروضات — تنظیم الفردوس
- ابتدائیہ — سیّد صبیح الدین رحمانی

۱۔ غالب کا نعتیہ کلام — ضیاء احمد بدایونی

۲۔ غزلیاتِ غالب میں نعت کی جلوہ گری — ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی

۳۔ غالب! حضور رسالت مآب ﷺ میں — پروفیسر شفقت رضوی

۴۔ غالب کی نعتیہ شاعری — ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری

۵۔ غالب کے فارسی کلام میں نعت — ادیب رائے پوری

۶۔ غالب کی مثنوی، بیانِ معراج کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

۷۔ غالب کی ایک نعتیہ غزل — پروفیسر محمد اقبال جاوید

۸۔ غزلیاتِ غالب کی زمینوں پر نعت گوئی — ڈاکٹر عاصی کرنالی

۹۔ غالب کی اردو شاعری میں مضامین نعت کا فقدان — عزیز احسن

۱۰۔ قدسی کی غزل پر غالب کی تضمین — پروسیر سیّد وزیر احسن

۱۱۔ عظمتِ رسولؐ خطوط غالب میں — ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

۵۔ اُردو نعت کی شعری روایت، اکادمی بازیافت، اکتوبر ۲۰۱۶ء

- حرفِ آغاز — صبیح رحمانی
- تعریف:

۱۔ نعت کی تعریف — ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق

۲۔ محرکات نعت — ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی

۳۔ اردو نعت گوئی کے موضوعات — ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

۴۔ نعتیہ شاعری کے لوازمات — ظہیر غازی پوری

۵۔ نعت کا مثالی اسلوبِ نظم — حافظ محمد افضل فقیر

۶۔ نعت تفہیمِ کائنات کا استعارہ — پروفیسر انوار احمد زئی

- تاریخ:

۷۔ اُردو نعت گوئی کا ارتقاء — ڈاکٹر شاہ ارشاد عثمانی

۸۔ اُردو نعتیہ شاعری کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ — ڈاکٹر مظفر حسن عالی

۹۔ اُردو میں نعت نگاری ایک جائزہ، ۱۹۷۵ء تک — ڈاکٹر انور سدید

- رجحانات:

۱۰۔ محسن کاکوروی—محمد حسن عسکری

۱۱۔ صنفِ نعت—مجید امجد

۱۲۔ جدید اُردو نعت—عارف عبدالمتین

۱۳۔ نعت کے فکری زاویے—ممتاز حسن

۱۴۔ نعت گوئی کا تصور انسان—جمال پانی پتی

۱۵۔ نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم—ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

۱۶۔ نعت گوئی اور جدید شعور—شمیم احمد

۱۷۔ جدید اُردو نعت اور علامت نگاری—احمد ہمدانی

۱۸۔ نعت: موضوعِ محض سے معجزۂ فن تک—ڈاکٹر ریاض مجید

۱۹۔ نعت اور اردو کی شعری تہذیب—مبین مرزا

۲۰۔ نعت کچھ روایتی اور کچھ غیر روایتی معروضات—ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

۲۱۔ نعتیہ رویہ—پروفیسر سمیع اللہ قریشی

۲۲۔ جدید اُردو غزل میں نعتیہ تخلیقی رویے کا وفور—ڈاکٹر نثار ترابی

۲۳۔ نعتیہ شاعری میں متنی وسعتوں کی تلاش—ڈاکٹر عزیز احسن

۲۴۔ اُردو نعت نگاری پر مابعد جدیدیت کے اثرات—کاشف عرفان

۲۵۔ نعت میں جدید طرزِ احساس—پروفیسر محمد فیروز شاہ

- تقاضے:

۲۶۔ اُردو نعت گوئی میں ہیئت کے تجربوں کی ضرورت—ڈاکٹر فرمان فتحپوری

۲۷۔ نقدِ نعت—تناظر اور تقاضے—پروفیسر سحر انصاری

۲۸۔ تحقیقِ نعت: صورت حال اور تقاضے—ڈاکٹر معین الدین عقیل

۲۹۔ نعت اور نقدِ نعت—چند گزارشات—ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

۳۰۔ نعت کہیے مگر احتیاط کے ساتھ—ڈاکٹر محمد اقبال جاوید

- اہلِ دانش کی آرا

۶۔پاکستانی زبانوں میں نعت: روایت اور ارتقاء نعت ریسرچ سنٹر کراچی: ۲۰۱۷ء

- معروضات—صبیح رحمانی

پنجابی:

۱۔ پنجابی نعتیہ شاعری کا ارتقاء—پروفیسر حفیظ تائب

۲۔ پنجابی زبان میں نعتیہ شاعری (تاریخ و رُجحانات)—ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی

۳۔ پنجابی شاعری میں نعت گوئی—صفدر وامقؔ

سندھی:

۴۔ سندھی نعتیہ شاعری کا مختصر جائزہ—ڈاکٹر نواز علی شوق

۵۔ سندھی زبان میں نعتیہ شاعری—ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی

۶۔ سندھی مولود—پروفیسر آفاق صدیقی

۷۔ سندھی نعتیہ شاعری پر ایک نظر—حافظ حبیب الرحمٰن سیال، بخشی

بلوچی:

۸۔ بلوچی زبان میں نعتیہ شاعری—ڈاکٹر انعام الحق کوثرؔ

۹۔ بلوچی میں نعت گوئی—کامل القادری

۱۰۔ بلوچی میں نعت گوئی—واحد بخش بزدار

پشتو:

۱۱۔ پشتو نعت کا ایک جائزہ—جاوید احساس

۱۲۔ پشتو میں نعت گوئی—پروفیسر خاطر غزنوی

۱۳۔ پشتو میں نعت—سلطان فریدی

۱۴۔ پشتو نعت—مشتاق احمد

۱۵۔ جدید پشتو ادب میں نعت گوئی—اشرف بخاری

سرائیکی:

۱۶۔ نعت میں کلاسیکی سرائیکی شعرا کا حصہ—ڈاکٹر مہر عبد الحق

۱۷۔ سرائیکی میں نعت گوئی کے عناصر—ڈاکٹر طاہر تونسوی

۱۸۔ سرائیکی شاعری میں نعت—خورشید ربّانی

۱۹۔ سرائیکی میں نعت گوئی—وفا چشتی

براہوی:

۲۰۔ براہوی نعت گوئی—ڈاکٹر عبد الرحمٰن براہوی

۲۱۔ براہوی نعت—ڈاکٹر انعام الحق کوثر

۲۲۔ براہوی ادب میں نعت گوئی—حاجی عبد اللطیف بنگل زئی

متفرق زبانیں:

۲۳۔ کشمیری میں نعت گوئی—ڈاکٹر صابر آفاقی

۲۴۔ ہندکو میں نعت—پروفیسر خاطر غزنوی

۲۵۔ گوجری نعت—ڈاکٹر غلام حسین اظہر

۲۶۔ کیمبل پوری بولی میں نعت—ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ

۷۔ کلامِ رضا، فکری و فنی زاویے، نعت ریسرچ سنٹر کراچی، ۲۰۱۷ء

۱۔ کلامِ رضا، فکری و فنی زاویے — فتح محمد ملک

۲۔ تفہیم کلامِ رضا۔۔۔ چند مفروضات — صبیح رحمانی

۳۔ کلامِ رضا میں توحید کی ضیاباریاں — پروفیسر فاروق احمد صدیقی

۴۔ کلامِ رضا میں مناقبِ صحابہ اور امہات المومنین — ڈاکٹر عزیز احسن

۵۔ کلامِ رضا میں اہلِ بیت کی جلوہ گری — رشید وارثی

۶۔ مولانا احمد رضا خان کی نعتیہ شاعری — ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

۷۔ حدائق بخشش — مجموعۂ صدق و صداقت — ڈاکٹر جمیل جالبی

۸۔ رضا بریلوی — ایک منفرد نعت گو — ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۹۔ کلامِ رضا اور علم بیان و بدیع — علامہ شمس بریلوی

۱۰۔ سلامِ رضا کے دو باغوں کی سیر — ڈاکٹر سیّد محمد ابو الخیر کشفی

۱۱۔ مولانا احمد رضا خان کی اُردو نعتیہ شاعری — ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

۱۲۔ کلامِ رضا — آئینہ رسول مرکزیت — احمد جاوید

۱۳۔ کلامِ رضا میں تازہ کاری کے امکانات کی تلاش — ڈاکٹر ریاض مجید

۱۴۔ کلامِ رضا کی منفرد ردیفیں — ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی

۱۵۔ فاضل بریلوی کا شعروژن — ریاض حسین چودھری

۱۶۔ کلامِ رضا اور صنعتِ محبوب کے مسائل — ڈاکٹر سید شمیم احمد گوہر

۱۷۔ کلامِ رضا کی لسانی تشکیلات اور اس پر مقامی اثرات — ڈاکٹر تنظیم الفردوس

۱۸۔ کلامِ رضا کے بعض اشعار کی فنی و لسانی توضیحات — ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی

۱۹۔ حدائق بخشش کی ایک مناجات — سلیم شہزاد

۲۰۔ کلامِ رضا میں زبان کا استعمال — ڈاکٹر محمد اشرف کمال

۲۱۔ کلامِ رضا میں ثقافتی عناصر کی تشکیل — پروفیسر کاشف عرفان

۲۲۔ کلامِ رضا میں سراپائے رسولِ اکرم ﷺ — ڈاکٹر افتخار شفیع

۲۳۔ کلامِ رضا کے کچھ لسانی گوشے — ڈاکٹر احمد بدر

۲۴۔ کلامِ رضا میں میلاد نگاری — ڈاکٹر مظفر عالم جاوید صدیقی

۲۵۔ کلامِ رضا میں عشقِ رسول ﷺ کی جمالیات — ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی

۲۶۔ کلامِ رضا اور علم القوافی — ڈاکٹر مفضل الرحمان شرر مصاحبی

۸۔ کلامِ محسن کاکوروی، ادبی و فکری جہات، اکادمی بازیافت، جولائی ۲۰۱۸ء

- حرفِ آغاز — صبیح رحمانی

۲۷۔ محسن کاکوروی کی نعت نگاری — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۲۸۔ محسن کاکوروی — محمد حسن عسکری

۲۹۔ محسن کاکوروی کی شعری کائنات — ڈاکٹر جمیل جالبی

۳۰۔ محسن کاکوروی کی نعت گوئی — ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۳۱۔ محسن کاکوروی کی مثنویاں — ڈاکٹر سیّد محمد عقیل رضوی

۳۲۔ محسن کاکوروی — کالی داس گپتا رضا

۳۳۔ سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل — ڈاکٹر اسلم انصاری

۳۴۔ محسن کاکوروی کا قصیدہ "مدیح خیر المرسلینؐ" — ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی

۳۵۔ محسن کاکوروی کی نعت گوئی — صلاح الدین احمد

۳۶۔ محسن کاکوروی کی نعت گوئی—ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی

۳۷۔ محسن کاکوروی منفرد نعت گو—ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

۳۸۔ مدیح خیر المرسلین کی ہندوئی اصطلاحات—ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

۳۹۔ محسن کی نعتیہ مثنویاں—ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی

۴۰۔ محسن کے قصیدے کا فنّی جائزہ—ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی

۴۱۔ اُردو ادب میں محسن کاکوروی کا مقام—ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتحپوری

۴۲۔ مدیح خیر المرسلین کی تشریح و تعبیر—ڈاکٹر مولا بخش

۴۳۔ کلامِ محسن کاکوروی پر ایک تنقیدی نظر—سلیم شہزاد

۴۴۔ محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری کا اسلوبیاتی مطالعہ—ڈاکٹر محمد اشرف کمال

۴۵۔ محسن کاکوروی: جمالِ سیّدِ ہر دو عالم کا منفرد زاویہ—ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

۴۶۔ عہد موجود میں محسن کی نعتیہ شاعری کا جواز—پروفیسر کاشف عرفان

۴۷۔ محسن کاکوروی کی نعت گوئی—ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق

۹۔ اقبال کی نعت، فکری و اسلوبیاتی مطالعہ، اکادمی بازیافت، ستمبر ۲۰۱۸ء

- اقبال کی نعت—چند باتیں، صبیح رحمانی
- علامہ اقبال، بارگاہِ رسالت میں، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
- اقبال اور مقام رسالت، سیّد عابد علی عابد
- اقبال کی نعت گوئی—ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق
- اقبال کی رباعیات میں نعت—ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری
- فکرِ اقبال میں مدحتِ رسولؐ—ڈاکٹر جمیل جالبی
- اقبال ایک ممتاز اور اہم نعت گو—ڈاکٹر فرمان فتح پوری

- اقبال حضورِ رسالت مآبؐ میں — پروفیسر فتح محمد ملک
- علامہ اقبال کی نعت گوئی — ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
- اقبال اور عشقِ رسولؐ — ڈاکٹر اسلم انصاری
- اقبال اور ثنائے خواجہؐ — ڈاکٹر تحسین فراقی
- اقبال: حرفِ نعت اور تشکیلِ افکار — مبین مرزا
- کلامِ اقبال میں نعتیہ عناصر — ڈاکٹر عزیز احسن
- اقبال ایوانِ نعت میں — پروفیسر محمد اکرم رضا
- ”بانگِ درا“ کی نعتیہ تب و تاب — پروفیسر محمد اقبال جاوید
- اقبال کی نظم ”ذوق و شوق“ حمد ہے یا نعت؟ — پروفیسر افضال احمد انور
- نعت سرائی — اقبال کی دوبیتی کا اعزاز — ڈاکٹر نوید احمد گِل
- کلامِ اقبال میں نعتیہ عناصر — ساختیاتی جائزہ — کاشف عرفان

۱۰۔ اُردو حمد کی شعری روایت، اکادمی بازیافت، اپریل، ۲۰۱۹ء

- پیشِ لفظ — صبیح رحمانی
- حمد، قرآن و حدیث کے آئینے میں — پروفیسر محمد اکرم رضا
- حمد و مناجات کی دینی و ادبی قدر و قیمت — مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی

۱۔ مبادیاتِ حمد — رشید وارثی

۲۔ معرفتِ حمد کے چند پہلو — پروفیسر محمد اقبال جاوید

۳۔ حمد کا اوّلین تصور — صباحت مشتاق

۴۔ مذاہبِ عالم میں تصورِ حمد — ڈاکٹر محسن نقوی

۵۔ اُردو کی حمدیہ شاعری کا جائزہ — ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتحپوری

۶۔ اُردو میں حمد یہ شاعری، تاریخ وارتقاء—ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

۷۔ حمد و مناجات بیسویں صدی میں—ڈاکٹر طفیل احمد مدنی

۸۔ اُردو مثنوی میں حمد و مناجات—ڈاکٹر سیّد عبد الباری

۹۔ حمد، ادب کی روایت میں—پروفیسر جیلانی کامران

۱۰۔ حمد یہ شاعری کی متنی وسعتیں—ڈاکٹر عزیز احسن

۱۱۔ حمد کا موضوعاتی پھیلاؤ—ڈاکٹر ریاض مجید

۱۲۔ حمد کی شعریات—سلیم شہزاد

۱۳۔ حمد، لفظی و صنفی تناظرات—ڈاکٹر ریاض مجید

۱۴۔ شکوہ اللہ سے خاکم بد ہن ہے مجھ کو—ڈاکٹر طارق ہاشمی

۱۵۔ اُردو میں حمد کے اسالیب—ڈاکٹر محمد اشرف کمال

۱۶۔ آزاد حمد یہ نظموں کا ساختیاتی مطالعہ—کاشف عرفان

۱۷۔ اردو غزل میں حمد یہ عناصر—خان حسنین عاقب

۱۸۔ پاکستانی اردو غزل میں حمد یہ عناصر—کاشف ضیاء

۱۹۔ حمد یہ شاعری میں صنائع و بدائع—ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی

نعتیہ ادب میں تنقیدی نظریات کا تحریری ثبوت بہت کم ملتا تھا، جس کے باعث یہ تصور عام ہو گیا تھا کہ اس مقدس صنف کی طرف اردو کے معروف ناقدین نے کوئی توجہ دی ہی نہیں۔ اس خیال کے بطلان کے لیے صبیح رحمانی نے دس تالیفات پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اردو کے سنجیدہ ناقدین نے نعت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن چوں کہ انھیں نعتیہ ادب میں ''ادبی معیارات'' پر پورا اترنے والا لوازمہ (Matter) کچھ زیادہ میسر نہیں ہو سکا، اس لیے اس موضوع پر ان کی توجہ بھی ذرا کم کم ہی رہی۔

صبیح کے تالیفی کام کی اہمیت کا ادراک اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ ان کی اس کاوش کو سراہنے کے لیے محترمہ ڈاکٹر طاہرہ انعام نے ''تالیفاتِ صبیح رحمانی: نقدِ نعت کی نئی تشکیل'' کے عنوان سے ایک گراں قدر کام کی داغ بیل ڈالی ہے۔ یہ فی الواقع ایک جہت نما اور رجحان ساز تصنیف ہے۔ کیوں کہ یہ ایک ایسے نابغۂ روزگار شخص کے تدوینی کاموں پر روشنی ڈالتی ہے جس نے نعت کی تخلیق، تحقیق، تدوین ہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا ہے۔ کسی کے تنقیدی شعور کی روشنی کے پھیلاؤ اور اس کی دوامی قدر (permanent value) کو جانچنا ہو تو، اس کے شعورِ انتخاب کو دیکھنا پڑتا ہے۔ محترمہ ڈاکٹر طاہرہ انعام نے صبیح رحمانی کے سلیقۂ انتخاب، اندازِ تحقیق اور حسنِ پیش کش کو دیکھ کر جس انداز سے اس کی پذیرائی کی ہے وہ لائقِ تحسین اور قابلِ تقلید ہے۔ صبیح کی دس تالیفات میں جس جس تنقیدی منہج کے اشارے ملتے ہیں وہ نعتیہ تنقیدی ماحول کو گرمانے کے لیے کافی ہیں۔ محترمہ ڈاکٹر طاہرہ انعام نے ان تالیفات میں محکم تنقیدی نقوش دیکھ کر ہی مستقبل کے امکانات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کتاب کے عنوان میں ''نقدِ نعت کی نئی تشکیل'' کا لاحقہ اسی اہم پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ ''نقدِ نعت کی نئی تشکیل'' کے مبحث کو انھوں نے جس تنقیدی بصیرت کے ساتھ حوالۂ قرطاس کیا ہے، وہ قابلِ تحسین اور لائق تقلید ہے۔ ان کا اسلوب علمی، استدلال منطقی اور تنقیدی شعور مستقبل شناس ہے۔ میں اس اہم کام کی تکمیل پر انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر عزیز احسن

rashidh30@gmail.com